وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

وفاق المدارس

ملتان

جلد نمبر ۲۱ شمارہ نمبر ۴ ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ نومبر ۲۰۲۳ء

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبد الرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 061-6514525-6514526-27 فیکس نمبر 061-6539485

Email:wifaqulmadaris@gmial.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ◉ مطبع: اقرا اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی بوہڑ گیٹ ملتان

شائع کردہ: مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

فلسطین.....''وہ چمن جس کو غنیموں نے خزاں بخت کیا''	کلمۃ المدیر	۳
ارضِ مقدس پر یہود کے حقِ تملیک کے قرآنی استدلال کا جائزہ	مولانا مفتی سمیع الرحمٰن	۱۰
امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ	مولانا مدثر جمال تونسوی	۱۸
طالب علم کو آداب کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے	الشیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ	۲۹
اولاد کی ظاہری و باطنی تربیت	مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی	۴۱
صالح اولاد کے لیے دعاؤں کا اہتمام	محمد احمد حافظ	۴۶
سوشل میڈیائی مصلحین و مفکرین.....دعوتِ محاسبہ	ابو دانیال محمد رضی الرحمٰن قاسمی	۵۳
صوبہ خیبر پختونخوا میں وفاق المدارس کی سرگرمیاں	مفتی سراج الحسن	۵۸
تبصرہ کتب	محمد احمد حافظ	۶۲

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر- سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر- ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زر سالانہ مع ڈاک خرچ: 500 روپے

فلسطین.....''وہ چمن جس کو غنیموں نے خزاں بخت کیا''

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کے یوم السبت کو مقبوضہ فلسطین میں صبح اس طرح طلوع ہوئی کہ غاصب اور قابض قوم یہود پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا، سیکورٹی ، حفاظتی دیواریں، اسلحہ کے انبار، جدید ترین جنگی ٹیکنالوجی، مسلمانوں پر ظلم ودہشت کے ذریعے عرصہ حیات تنگ کردینے کی فضا.....قوم یہود کے لیے ہر طرف چین ہی چین تھا، مگر اس دن شاید غزہ کے شاہینوں نے سوچ لیا تھا کہ اب کچھ بھی ہو ہر حال میں اپنا حق آزادی لینا ہے، اس لیے بے خوف وخطر اپنے سے کئی گنا بڑا حجم رکھنے والے دشمن سے بھڑ گئے۔ اب تک اسرائیل کے نقصانات کی تفصیل سامنے آئی ہے اس کے مطابق پچھلے ستر سال کی تاریخ میں غاصب قوم یہود کو پہلی مرتبہ اس قدر جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اسرائیل کا تکبر اور اس کے ناقابل تسخیر ہونے کا زعم مکڑی کے جالے سے بھی کمزور ثابت ہوا ہے۔ تادم تحریر یہ جنگ جاری ہے، اور حماس مجاہدین اسرائیل کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں، اگرچہ حماس کے ان حملوں کے بعد اسرائیل نے غزہ کو ملیامیٹ کردیا ہے.....لیکن یہ پہلی مرتبہ نہیں ہورہا، غزہ پہلے بھی کئی مرتبہ تباہ ہوکر پھر آباد ہوا ہے۔ وہاں کے باشندے کچھ ایسے سخت جان واقع ہوئے ہیں کہ زخموں سے چور ہوکر پھر جی اٹھتے ہیں اور دوبارہ سر اٹھا لیتے ہیں۔ اس موقع پر وفاق المدارس العربیہ کے قائدین نے اپنے مشترکہ بیان میں اسرائیلی جارحیت کی شدید مذمت اور فلسطینی مجاہدین کی مکمل حمایت کا اعلان کیا، وفاق المدارس العربیہ کے اعلامیے کے مطابق:

''وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، نائب صدر مولانا انوار الحق، ناظم اعلیٰ مولانا محمد حنیف جالندھری سمیت دیگر قائدین نے اپنے مشترکہ بیان میں عالم اسلام سے فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کی ہر طرح سے تعاون کی اپیل کردی ہے، انہوں نے کہا کہ مسلمان حکمرانوں اور مسلم معاشروں پر اپنے اپنے دائرہ کار کے حساب سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تمام مسلمانوں کو فلسطین کے معاملے میں اپنا بھرپور اور موثر کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ وفاق المدارس کے قائدین نے کہا کہ آج کے دور میں کسی کو ظلم وستم سے غلام بنایا جاسکتا ہے اور نہ ہی جبر کے ہتھکنڈوں سے کسی کی سرزمین پر قبضہ کیا جاسکتا ہے، اس لیے مسجد اقصیٰ اور فلسطین کو فی الفور آزاد قرار دیا جائے اور اسرائیل کا قبضہ ختم کروانے کے لیے تمام تر کوششیں بروئے کار

لائی جائیں۔وفاق المدارس کے قائدین نے عالمی برادری پر زور دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ مستقل بنیادوں پر حل کیا جائے ورنہ پوری دنیا کا امن وامان ہمیشہ داؤ پر لگا رہے گا۔وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے قائدین نے فلسطینی مظلوم مسلمانوں کی مدد ونصرت، شہداء کے درجات کی بلندی، زخمیوں کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا بھی کی اور ملک بھر کی مساجد ومدارس کے ذمہ داران کے نام بھی ہدایات جاری کیں کہ وہ دعاؤں کا خصوصی اہتمام کریں اور فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کریں۔''

آزادی سے جینا ہر قوم کا مسلّمہ حق ہے۔ ہر قوم کو دیگر اقوام کی بالادستی اور دباؤ کے بغیر آزادانہ طور پر اپنا نظام حکومت چلانے کی مکمل آزادی ہے اور کسی بھی ریاست کے باشندوں کو مذہبی، سیاسی اور سماجی طور پر اپنی زندگی اپنے عقیدہ ونظریہ کے مطابق گزارنے کا حق حاصل ہے۔یہی حق فلسطینی باشندوں کو بھی حاصل ہے۔ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج مسئلہ فلسطین کی تاریخی ومذہبی حیثیت کو ایک بار پھر تازہ کرلیا جائے۔

ہم مسلمانوں کا ارض فلسطین سے ایمانی، قلبی اور جذباتی تعلق ہے اور اس تعلق کی گہری بنیادیں ہیں۔خالقِ کائنات اللہ رب العزت اپنے بندے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے فلسطین اور وہاں سے سفرِ معراج پر لے گئے۔اپنی نشانیاں دکھائیں، جنت ودوزخ کے مناظر دکھاتے ہوئے امتیوں کے لیے نصیحت کا اہتمام فرمایا۔ آنکھوں کی ٹھنڈک (نماز) کا تحفہ عطا فرمایا اور پھر اس واقعے کو اپنی کتابِ مبین کا حصہ بنادیا، تاکہ تا قیامِ قیامت سیرتِ طیبہ کے اس اہم باب کی تلاوت ہوتی رہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَآ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ o

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دُور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا''۔(بنی اسرائیل:۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد اقصیٰ لے جایا جانا، تمام انبیاء کا وہاں دوبارہ اتارا جانا اور آپؐ کی امامت میں نماز ادا کرنا، اس بات کا اعلان بھی تھا کہ باقی تمام شریعتیں اختتام پذیر ہوئیں؛ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت ہی ان تمام تعلیماتِ الٰہیہ کا نقطۂ کمال ہے۔مکہ مکرمہ میں رہتے اور مدینہ منوّرہ ہجرت کے ۱۷/ ماہ بعد تک، اسی مبارک حرم اقصیٰ ہی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے امتیوں کے لیے قبلہ بنائے رکھا گیا۔

یہ حقیقت اہم تر ہے کہ سرزمینِ اقصیٰ کے مبارک ہونے کا ذکر صرف اسی آیت میں نہیں، بلکہ قرآن کی پانچ

آیات میں کیا گیا ہے۔ ابوالانبیاء سیدنا حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت لوط، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت صالح، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم السلام سمیت تقریباً ۱۴؍انبیاء اس مقدس سرزمین پر قیام پذیر رہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب فتوحات ہوئیں اور سرزمین شام اسلام کے زیر نگیں آئی تو خطہ فلسطین بھی فتح ہوا، اور بیت المقدس کی کنجیاں خود وہاں کے سرکردہ اَحبار ورُہبان نے خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کیں، یہ گویا اپنے حق تولیت سے دست برداری کا اعلان تھا، اور یہ مسلمانوں کی امانت تھی جو ان کے سپرد کر دی گئی۔ حقیقت میں اسلام آجانے کے بعد اب اس مقدس سرزمین پر کسی منسوخ دین کا حق تولیت باقی نہیں رہا تھا۔

خطہ فلسطین تب سے لے کر ۱۹۱۷ء تک (درمیان کے چند مختصر ادوار کو چھوڑ کر) مسلم خلافت کا حصہ رہا ہے۔ اس کا رقبہ ۲۷۰۰۹ کلومیٹر کو محیط ہے۔ اس کے مشرق وشمال میں جہاں پہاڑوں کا طویل سلسلہ ہے وہیں مغربی علاقہ اپنی زرخیز اور ہموار زمینوں کی بدولت نباتات سے مالا مال ہے۔

یوں تو فلسطین کے بہت سے شہر تاریخی پس منظر اور جغرافیائی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ''القدس'' سب سے مشہور ومعروف ہے۔ مسجد اقصیٰ اسی شہر میں واقع ہے۔ ''القدس'' سے بالکل متصل دوسرا شہر ''الخلیل'' ہے جس میں مسجد ابراہیم ہے۔ اس شہر کی وجہ تسمیہ بھی سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ کا مزار مبارک بھی یہیں واقع ہے۔ فلسطین، امن کا گہوارہ اور صدیوں مسلم دنیا کا حصہ رہا ہے، بلکہ مسلمانوں کے اقتدار کے زیر اثر تینوں آسمانی مذاہب کے پیروکار یہاں امن کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔

فلسطین کا آج کا المیہ یہ ہے کہ استعماری سازشوں کی وجہ سے یہ ملک صرف تاریخ کے صفحات میں پایا جاتا ہے۔ زمینی حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل نام کی یہودی ریاست اپنے تمام تر استبداد کے ساتھ موجود ہے۔ وہاں کے اصل باشندوں کی فلسطینی اتھارٹی محدود اختیارات رکھنے کے باوجود زمین سے محروم ہے جو کسی بھی ریاست کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ایک محدود سا علاقہ غزہ کی پٹی ہے جہاں حماس کی عمل داری ہے۔ یہی پٹی فلسطینیوں کی جانب سے اس وقت مقاومت اور مزاحمت کا مرکز اور علامت ہے۔

اسرائیل کے قیام کا پس منظر یہ ہے کہ اس کا خواب ویانا کے صحافی تھیوڈور ہرٹزل نے دیکھا تھا، اسی نے سب سے پہلے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اپنی ایک رپورٹ میں اس نے کہا تھا:

''مجھے یہ یقین ہے کہ ہم ایک دن کرہ ارض پر ایک یہودی ریاست قائم کر کے ہی دم لیں گے۔ چاہے وہ ارجنٹینا میں ہو یا فلسطین میں، اس ریاست کے قیام کے بغیر دنیا بھر کے یہودی، آزادی، عزت اور

خوشحالی کی زندگی گزارنے کے قابل نہ ہوں گے۔''

ہرٹزل نے صرف اپنی رپورٹ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ برطانیہ سمیت دنیا کی بڑی طاقتوں کی حمایت بھی حاصل کر لی۔اس نے اپنی سفارت کاری کے ذریعے اس وقت کی عثمانی سلطنت کو فلسطین کے بدلے استنبول میں ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے قیام اور اس کے تمام غیر ملکی قرضہ جات ادا کرنے کی تجویز بھی پیش کی جسے سلطان عبدالحمید عثمانی نے سختی سے رَد کر دیا تھا۔اس کے باوجود بین الاقوامی سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ان یہودی قوتوں نے ترکی کی ''ینگ ترک پارٹی'' میں اپنا اثر ورسوخ پیدا کر کے سب سے پہلے سلطان عبدالحمید عثمانی کو معزول کیا۔اس کے بعد شریف مکہ کے ذریعے عربوں کی آزادی اور مرکز خلافت سے باغیانہ تحریک کی داغ بیل ڈالی۔حجاز کے والی کو لالچ دیا گیا کہ وہ اگر خلافت عثمانیہ سے بغاوت کرتے ہوئے ان کے منصوبے کا ساتھ دے، تو اسے پورے جزیرہ عرب، عراق اور شام سمیت عالم عرب کے اکثر علاقوں کا تاج دار بنا دیا جائے گا۔موصوف نے ۱۵؍جون ۱۹۱۶ء کو خلافت سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا۔مسلمانوں کی قوت تقسیم اور کمزور ہوئی تو دسمبر ۱۹۱۷ء تک سرزمین فلسطین پر برطانوی قبضہ مکمل ہو گیا۔برطانوی افواج کا سربراہ جنرل ایلن بے (Allenby) سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کے پاس پہنچا اور اس پر پاؤں رکھتے ہوئے بولا: ''آج صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہو گیا''۔گویا یہ سارا منصوبہ بیت المقدس پر قبضے کے لیے لڑی جانے والی آٹھ سو سالہ صلیبی جنگوں کا تتمہ تھا۔

اسی عرصے میں برطانیہ کی جانب سے اعلان بالفور سامنے آیا۔اعلانِ بالفور برطانوی حکومت کی صیہونی یہودیوں سے ایک خفیہ معاہدے کی توثیق تھی جس کا تعلق پہلی جنگِ عظیم کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکڑے کرنے سے تھا۔اس اعلان کی علامت برطانوی دفترِ خارجہ کے ایک خط کو سمجھا جاتا ہے جو ۲؍نومبر ۱۹۱۷ء کو آرتھر جیمز بالفور (سیکریٹری خارجہ) نے صیہونیوں کے نام لکھا تھا۔اس خط میں برطانیہ نے صیہونیوں کو اس بات کا یقین دلایا ہے کہ وہ فلسطین کی سرزمین میں ایک یہودی ریاست کے قیام میں بھرپور اور عملی مدد دیں گے۔خط میں یہ بھی بتایا گیا کہ اس معاہدہ کی توثیق برطانوی کابینہ کے ایک خفیہ اجلاس میں ۳۱؍اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ہو چکی ہے۔اسی اعلان کے تحت اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔

۲؍نومبر ۱۹۱۷ء کو لکھے گئے برطانیہ کے اس وقت کے سیکریٹری خارجہ آرتھر جیمز بالفور کے خط کے متن کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے:

''محترم روتھشائلڈ!..... مجھے شاہ برطانیہ کی طرف سے آپ کو بتاتے ہوئے ازحد خوشی ہو رہی ہے کہ درج ذیل اعلان صہیونی یہودیوں کی امیدوں کے ساتھ ہماری ہمدردی کا اظہار ہے اور اس کی توثیق ہماری

کیبینیٹ بھی کر چکی ہے۔شاہ برطانیہ کی حکومت فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کی حامی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی ہر ممکن صلاحیت کو بروئے کار لائے گی مگر اس بات کو مدِ نظر رکھا جائے کہ فلسطین کی موجودہ غیر یہودی آبادی (مسلمان اور مسیحی) کے شہری و مذہبی حقوق یا دوسرے ممالک میں یہودیوں کی سیاسی حیثیت کو نقصان نہ پہنچے۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر اس اعلان کو صہیونی فیڈریشن کے علم میں بھی لایا جائے.....آپکا مخلص آرتھر جیمز بالفور۔''

یہ مکتوب ارب پتی یہودی لیونل والٹر روتھشائلڈ کو بھیجا گیا اور اس مکتوب کے بعد برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کے ایک ریاست کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا۔

فلسطین کے برطانوی مینڈیٹ سنہ ۱۹۲۲ء-۱۹۴۸ء نے صہیونی تحریک کی مکمل طرف داری کی جس کے نتیجے میں یہ تحریک فلسطین میں ایک یہودی ریاست کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔سنہ ۱۹۳۹ء تک یہودی ریاست صرف کاغذوں اور خاکوں کی حد تک محدود تھی۔اس کے بعد یہودی کاروباری اور سیاسی لیڈروں نے فلسطین میں یہودیوں کا سرمایہ منتقل کرنا شروع کیا۔ یورپ سے فلسطین کو منتقل کی جانے والی رقم فلسطین میں یہودی جرائم پیشہ اور دہشت گرد عناصر کو فراہم کی جانے لگی۔اس رقم سے انہوں اسلحہ خرید کر فلسطینیوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا تو صہیونی تحریک اور برطانوی سامراجی حکومت کے درمیان تعلقات مزید پختہ ہوتے گئے۔اس برطانوی "وعدے" کا نتیجہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین کے عوام اور سرزمین کی قیمت پر نام نہاد ''اسٹیٹ آف اسرائیل'' کی صورت میں سامنے آیا۔ جہاں صہیونی گروہوں نے فلسطینیوں کے خلاف درجنوں قتل عام، مظالم اور لوٹ مار کے جرائم کا ارتکاب کیا۔ پانچ سو سے زائد دیہات کو مسمار اور اور صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یہودی ریاستی دہشت گردی کا مقصد فلسطینیوں کو ختم کرنا اور آس پاس کے علاقوں میں خوف و ہراس پھیلانا تھا تاکہ فلسطینی باشندوں کو بعد میں نقل مکانی کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ جزیرہ نما النقب میں بسنے والے ہزاروں فلسطینیوں کو بندوق کی نوک پر وہاں سے بے دخل کر دیا گیا۔

بلاشبہ فلسطین پر برطانوی قبضہ نو آبادیاتی نظام کے قیام اور توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کی خاطر تھا۔اس دوران خاص لائحہ عمل سے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری شروع ہوئی۔ دنیا کے مختلف ملکوں سے یہودی فلسطین میں آ کر آباد ہونے لگے۔ فلسطینی عوام نے فلسطین پر برطانوی راج اور اعلان بالفور کے ذریعے فلسطین میں یہودی آباد کاری کی شدید مخالفت کی، عالم اسلام میں بھی اس کا شدید ردعمل سامنے آیا۔

پاکستان کے بانیان قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کا موقف ہمیشہ فلسطینی عوام کے حق میں رہا۔وہ مسئلہ

فلسطین کو بہت گہری نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور صہیونی تحریک کی کامیابی کی صورت میں مستقبل کے حوالے سے خدشات رکھتے تھے، برصغیر میں علامہ اقبال مرحوم شاید پہلے شاعر تھے جو جدید مشرقی اور مغربی علوم پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ وہ نوآبادیاتی نفسیات اور سامراج کی چالوں سے خوب آگاہ تھے، اس لیے ان کی شاعری اور نثر میں نو آبادیاتی سوچ کے بارے میں منطقی اظہار خیال ملتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے ایک خط میں جناح صاحب کو لکھتے ہیں:

''میں فلسطین کے مسئلے کے لیے جیل جانے کے لیے تیار ہوں اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ فلسطین نہ فقط ہندوستان کے لیے بلکہ اسلام کے لیے بہت عظیم ہے... یہ ایشیا کا دروازہ ہے جس پر بُری نیت سے اقدامات کیے جا رہے ہیں''۔

۱۹۳۷ء میں جب برطانیہ کی طرف سے فلسطین کی تقسیم کی تجویز سامنے آئی تو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اس تقسیم کی شدید مذمت کی۔ دوسری عالمی جنگ میں لاکھوں یہودی ہٹلر کے نازی ازم کا شکار ہوئے۔ بچ جانے والے یہودیوں کو نازی کیمپوں سے نکال کر سرزمین فلسطین میں منتقل کر دیا گیا جس سے اس خطے میں یہودیوں کی عددی قوت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں عربوں نے اپنے بہت سے علاقے یہودیوں کو فروخت بھی کیے تھے۔

۱۹۴۳ء میں یہودیوں نے یورپ اور امریکہ میں پراپیگنڈا مہم چلا کر اسرائیلی ریاست کے باقاعدہ قیام کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ انہی دنوں ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے بانی پاکستان محمد علی جناحؒ نے کہا:.....

''اگر یہودی عناصر کے دباؤ کے تحت (امریکی) صدر روزویلٹ، برطانیہ کو فلسطین کے سوال پر عربوں سے ناانصافی کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو یہ فیصلہ مسلم دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آگ لگا دے گا۔ اگر یہودیوں کی آبادکاری کا سلسلہ جاری رہا تو پوری اسلامی دنیا اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی۔''

جناح صاحب نے یونائیٹڈ پریس امریکا کے نامہ نگار مسٹر ارنسٹ سی۔ مارٹی سے اپنی ایک ملاقات میں کہا:

''دیانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تبدیلی وطن کی خاطر یہودیوں کی فلسطین آمد ختم کر دی جائے۔ تبدیلی وطن کے اصول اور اس دلیل کی بنیاد پر پانچ لاکھ یہودیوں کو پہلے ہی فلسطین میں داخلے کی اجازت دی جا چکی ہے۔ یہ تعداد عربوں کی آبادی کے ایک تہائی کے برابر ہے جسے کوئی ملک نہ گوارا کرے گا اور نہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی نظیر موجود ہے۔''

اسی ملاقات میں آپ نے امریکہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

''نہ ان کا کوئی ضمیر ہے نہ انہیں عدل یا انصاف کا کوئی لحاظ- امر واقعہ یہ ہے کہ امریکی صہیونی، امریکہ کو ناک سے پکڑ کر جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں- یہ حیرت انگیز بات ہے کہ قرنوں کی کشمکش کے بعد خود امریکیوں نے ہندیوں کے لئے حال ہی میں ۱۰۰/افراد سالانہ کا کوٹہ منظور کیا ہے-'' (دی ڈان، ۳۱، جولائی، ۱۹۴۶ء)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہودیوں کی پشت پناہی میں امریکہ اور برطانیہ کا ہاتھ نہ ہوتا تو وہ کبھی اس حد تک نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن کیا کیا جائے کہ یہ دونوں بھی تو صہیونیت کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے- علامہ اقبال نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ.....''فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے!''

قیامِ پاکستان کے صرف ایک ماہ بعد قائداعظم نے فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی کے نام خط میں تحریر کیا:

''پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان عربوں کے قومی مقاصد کے حصول کے لیے دِلی طور پر آپ کے ساتھ ہیں- ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے اور ہر ممکن مدد کریں گے-'' (پاکستان ٹائمز، ۱۳/ستمبر، ۱۹۴۷ء)

ہمارے لیے مقام اطمینان ہے کہ مسئلہ فلسطین میں بانیان پاکستان سے لے کر آج تک ہمارا ریاستی موقف فلسطینی عوام کی امنگوں کے مطابق رہا ہے۔ کبھی کبھی اسرائیل کو تسلیم کرنے اور دو ریاستی حل کی باتیں گونجنے لگتی ہیں، مگر نظریہ پاکستان کے محافظ علماء بروقت گرفت کر کے ایسی باتوں کو پنپنے سے روکتے رہے ہیں۔

گزشتہ کچھ عرصہ سے عرب دنیا میں اور باقی عالم اسلام میں اسرائیل کو تسلیم کرنے کی نہایت مضبوط مہم چل رہی تھی، لیکن فلسطینی مجاھدین کی حالیہ مقاومت اور بے مثل مزاحمت نے اس مہم میں بہت بڑا شگاف ڈالا ہے، اور اسرائیل کے مسلم حامیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ امید ہے کہ حماس مجاہدین اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے۔ عالم اسلام کے ہر فرد کو چاہیے کہ اس فلسطینی مجاہدین کی حمایت ونصرت میں جو کر سکتا ہے کر گزرے۔ فلسطینیوں کی مالی، جانی، اخلاقی، ابلاغی حمایت کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑے، یہ اقصیٰ کا مسئلہ ہے، ہمارے قبلہ اول کی آزادی کا معاملہ ہے۔ صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے ٹویٹر اکاؤنٹ پر عالم اسلام کے نام اپنے پیغام میں کہا ہے کہ:

''حماس کے جانباز مجاہدین تاریخ کا منفرد معرکہ سر کر رہے ہیں، اور اسرائیل کی طرف سے غزہ کی شہری آبادی پر وحشیانہ بمباری ہو رہی ہے۔ یہ ایسا موقع ہے کہ جس میں عالم اسلام کا فرض بنتا ہے کہ وہ متحد ہو کر مظلوم فلسطینیوں کو ہر قسم کی مدد پہنچائیں تاکہ فلسطین کا مسئلہ انصاف کے ساتھ ہمیشہ کے لیے حل ہو۔''

☆☆☆

ارضِ مقدس پر یہود کے حق ِ تملیک کے قرآنی استدلال کا جائزہ

مولانا مفتی سمیع الرحمٰن

یہود کا دعویٰ ہے کہ ارضِ مقدس فلسطین ان کا قومی وطن ہے، وہ اپنے دعویٰ کی سچائی کے لیے تاریخی، سیاسی سفارتی حکمت عملی کے ساتھ نظریاتی دلائل بھی بروئے کار لاتے ہیں، چونکہ ان کے عزائم میں بڑی رکاوٹ اسلام ہے۔اس لیے مسلمانوں کو زیر کرنے کی لیے مصادر شرعیہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، یہود کی یہ فکری خدمت مستشرقین نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ ہمارے برّصغیر میں جو حلقہ مستشرقین کے زیر اثر رہ کر ان کے دعاوی کو مقبول بنانے کی سعی میں مصروف رہتا ہے، اُس کی طرف سے اس دعویٰ کو تقویت پہچانے کے لیے قرآن کریم کی دو آیتوں سے بھی استدلال پیش کیا جاتا ہے، ذیل کے مضمون میں انہیں استدلال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

☆☆☆

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت فرما کر فلسطین تشریف لائے اور یہیں سکونت پزیر ہو گئے، یہیں ان کے صاحب زادے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام پلے بڑھے، جب حضرت یعقوب کے فرزند حضرت یوسف مصر میں منصب اقتدار پر پہنچے تو اپنے پورے خاندان کو جو ستّر افراد کے کنبے پر مشتمل تھا مصر بلا لیا۔۴۳۰ سال تک یہ خاندان مصر میں پھلتا پھولتا رہا، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان میں پیدا ہوئے اور انہیں مصریوں کی غلامی سے نکال کر صحرائے سینا میں لے آئے، ان کے متروکہ شہر فلسطین پر کافر قوم آباد ہو چکی تھی، اسرائیلیوں کی تعداد تورات کی روایت کے مطابق لاکھوں میں تھی مگر فلسطین میں بغیر مزاحمت کے نہیں بس سکتے تھے، اس لیے اللہ تعالی نے فلسطین کی کافر قوم کے ساتھ قتال فی سبیل اللہ کا حکم فرمایا لیکن اسرائیلیوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا، چنانچے سزا کے طور پر چالیس سال تک ان پر ارض مقدس حرام کر دی گئی، یہاں تک کہ حضرت موسی علیہ السلام کا اسی صحرائے سینا میں وصال ہو گیا۔اس کے بعد حضرت موسیٰ کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام کی سرپرستی میں یہودیوں نے قتال فی سبیل اللہ کا فریضہ انجام دیا تو یہ شہر ان کے قبضے میں آ گیا۔ یہودیوں نے اسی بنیاد پر ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ ارض مقدس ہماری آبائی سرزمین ہے، ہم اس میں سکونت اور قومی اقتدار کا استحقاق رکھتے

ہیں۔عالمی استعمار کی سہولت کار اور نمائندہ جماعت اقوام متحدہ نے اپنی سرپرستی میں ایک قرارداد پاس کی جس کی روشنی میں ۱۹۴۸ میں اعلان بالفور کے مطابق دوریاستی فارمولے کے تحت اسرائیل نامی مملکت وجود میں آ گئی۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں کا فلسطین پر اقتدار اور قبضہ کے دعوی کا استحقاق کس بنیاد پر ہے؟ تاریخی بنیاد پر یا مذہبی بنیاد پر؟ اگر تاریخی بنیاد پر ہے تو بھی درست نہیں ہے،تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس شہر کو کنعانیوں اور یبوسیوں نے آباد کیا تھا۔چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے رکن عبداللہ بن صالح بن العبید لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ القدس ایک عبرانی شہر ہے یہ دعویٰ ان تاریخی دستاویزات کو نظر انداز کرنے پر مبنی ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ ''القدس'' شہر کے طور پر برونزی عہد کی ابتداء میں آباد ہونا شروع ہوا تھا اور اس کی تعمیر کنعانیوں نے کی تھی۔آثار قدیمہ کے انکشافات اور تاریخی مآخذ کی مطابق فلسطین میں عربوں کی تاریخ چھے ہزار سال پرانی ہے''۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ فلسطین میں عربوں کا وجود اسرائیلی حملے سے ۲۶۰۰ سو سال مقدم ہے۔اس سے یہودیوں کی القدس پر ملکیت کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔حالانکہ قدیم تاریخ کے مطابق یہودیوں کی القدس پر حکومت مسلسل ۷۰ سال سے زیادہ نہیں رہی۔ ہفت روزہ العالم الاسلامی ،خلاصہ ص:۱۵،۱۹۹۹)

اس سے زیادہ عرصہ تو مغل اور افغانستان کے مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان پر اور عرب مسلمانوں نے ہسپانیہ پر حکومت کی ہے۔اگر ستر سال کی مسلسل حکومت سے ملکیت ثابت ہوتی ہے تو مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ ہندوستان اور ہسپانیہ پر اپنے استحقاق کا دعویٰ جتلائیں،اسے کیوں خاطر میں نہیں لایا جاتا؟اس دوغلے رویہ پر احتجاج کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

لیکن یہاں سر دست اس قرآنی استدلال کا جائزہ لینا ہے جو استشراقی فکر سے متاثرہ حلقے کی طرف سے یہود کے دعوی استحقاق میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہود کی حق تملیک پر قرآنی استدلال کا جائزہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خطاب نقل فرمایا ہے جس میں آپ نے اپنی قوم کو کہا

ہے:یقومِ ادخُلوا الا?رضَ المقدّسۃَالّتی کَتبَ اللہُ لکمْ)اے میری قوم ارض مقدس میں داخل ہوجاؤ جسے اللہ تعالی نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے(اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے کہ''پس اللہ تعالی نے کَتَبَ اللّٰہُ لکُم کے ذریعے یہ مقدس سرزمین یہود کے حق میں مقدّر فرمادی ہے،جس پر اقتدار وسکونت اور تملیک کا ابدی استحقاق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ملا ہے،کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ سرزمین سے ان کو بے دخل کرے''

پہلا جواب:

جب سے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے اس وقت سے آج تک کسی صحابی،تابعی،مفسر،محدث،مجتہد نے کتب اللہ لکم سے یہ مراد سمجھی ہے نہ یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ اس سے یہود کی مقدس سرزمین پر ابدی حقِ تملیک ثابت ہوتی ہے۔ اگر یہ مراد اتنی واضح تھی تو سلفِ صالحین اس پر کلام فرماتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے جلاوطن کردہ یہودیوں کو ان کی آبائی استحقاقی سرزمین یاد دلاتے،حضرت عمر فاروق ارضِ مقدس کو فتح کرنے کے بعد اس آیت پر عمل کرتے ہوئے دربدر بھٹکتے یہودیوں کو یہ سرزمین حوالہ کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتے۔لیکن اس آبائی حق تملیک پر نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا نہ حضرت عمر فاروق نے غلبہ پا کر یہ سرزمین یہودیوں کے حوالہ کی،نہ کسی صحابی نے انہیں قرآنی آیت سنا کر یہ حکم الٰہی یاد دِلایا۔یہ نادر خیال اور استدلال آیا تو صرف اور صرف استشراقی فکر سے فیض یاب ہونے والے محققین کو آیا۔

دوسرا جواب:

قرآن کریم میں کتب کا لفظ کئی معنی میں آیا ہے۔

1. کتب بمعنی قضیٰ .....فیصلہ کرنا۔(جیسے کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنّ اَنَا وَرُسُلِی۔دیکھیے تفسیر طبری:المجادلۃ:ذیل آیت:۲۱)
2. کتب بمعنی امر (تفسیر طبری:المائدۃ:ذیل آیت:۲۱)
3. کتب بمعنی وعد(تفسیر ابنِ کثیر:المائدۃ:ذیل آیت:۲۱)
4. کتب بمعنی وھب(تفسیر طبری:المائدۃ:ذیل آیت:۲۱)
5. کتب یعنی کتب فی اللوح المحفوظ(تفسیر الآلوسی:ذیل آیت۲۱)
6. کتب ای قدّرھا وقسمھا لکم(تفسیر الآلوسی:ذیل آیت۲۱)

ان معانی میں سے کوئی ایک معنیٰ بھی ابدی حقِ تملیک اور دائمی حقِ استقرار پر دلالت نہیں کرتا،کتب اللہ لکم کے

ذریعے جو وعدہ یہود سے کیا گیا تھا اس وعدہ کی تکمیل ایک مرتبہ یہود کے ارض مقدس میں داخل ہونے سے پوری ہوجا تی ہے۔ چنانچہ امام طبری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ نکتہ اعتراض اٹھایا کہ جب **فإنّها مُحرّمة عليهم** کے ذریعے ارض مقدس یہود پر حرام کر دی گئی ہے تو پھر لوح محفوظ میں لکھا کیسے ثابت ہوگا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: اسرائیلیوں کے لیے جو مقامِ سکونت مقدر میں لکھا گیا تھا وہ بعد میں ارض مقدس میں داخل ہونے اور اسے جائے سکونت بنانے سے پورا ہوگیا۔ (اس میں تسلسل اور دوام کا پایا جانا ضروری نہیں ہے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہونا دلیل ابدیت نہیں ہے)

مزید برآں لوحِ محفوظ کے مندرجات میں تغیّر وتبدل جاری رہتا ہے، محض مقدّر اور لوح محفوظ میں درج ہونے سے کسی امر کو دوام وابدیت کی دلیل نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لِکلِ اجلٍ کتاب **يَمْحُو اللّٰهُ ما يَشَاءُ و يُثْبِتُ و عِنْدَه أُمُّ الكتاب** (الرعد:۳۸،۳۹) ’’ہر ایک وعدہ ہے لکھا ہوا، مٹا تا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب۔‘‘

چنانچہ حضرت عمر فاروق کے متعلق آتا ہے آپ دوران طواف روتے ہوئے دعا کرتے تھے:

اللّٰهم إن كُنْتَ كَتَبْتَنِي فی اهل السعادة فأثبتنی فيها، وإن كنت كتبتنی فی اهل الشقاوة والذنب فامحُنی وأثبتنی فی اهل السعادة والمغفرة فإنّک تمحو ما تشاء وتثبت وعندک امّ الكتاب (اے اللہ اگر آپ نے مجھے (لوح محفوظ میں) اہل سعادت میں لکھ رکھا ہے تو اسے ثابت رکھیے اور اگر آپ نے مجھے (لوح محفوظ میں) بد بخت اور گناہگاروں میں لکھا ہے تو یہ لکھا مٹا دیجئے اور اہل سعادت ومغفرت میں ٹھہرا دیجئے، بے شک آپ جو چاہتے ہیں مٹاتے ہیں اور جسے چاہے ثابت رکھتے ہیں اور آپ ہی کے پاس لوح محفوظ ہے)

[تفسیر القرطبی: الرعد: ذیل آیت: ۳۹]

اسی طرح کی دعا حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی مروی ہے۔ حضرت مالک بن دینار نے ایک خاتون کو دعا دیتے ہوئے فرمایا: **اللّٰهم إن كان فی بطنها جاريةٍ فأبدلها غلاماً فإنّک تمحو ما تشاء و تثبت و عندک ام الكتاب** ۔ (اے اللہ اگر اس کے پیٹ میں باندی ہے تو اسے غلام سے بدل دے، بے شک تو مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے اور آپ کے پاس ہی لوح محفوظ ہے۔

[تفسیر القرطبی: الرعد: ذیل آیت :۳۹]

لہذا معلوم ہوا کہ محض لوح محفوظ میں لکھے جانے کسی چیز کا دوام ثابت نہیں ہوتا اور لوح محفوظ کے مندرجات میں

تغیّر وتبدل بھی رہتا ہے، ہاں علمِ الٰہی ازل سے ابد تک تغیّر وتبدل سے پاک اور محفوظ ہے۔

تیسرا جواب:

اگر کتب اللہ لکم کی بنا پر ارض مقدس یہود کے حق میں مقدّر ہو چکی تھی تو پھر **فإنّها محرّمة عليهم** کے ذریعے چالیس سال تک یہود کو ان کے حق سے کیوں محروم کر دیا گیا؟ اس کے جواب میں استشراقی حلقہ فکر کے احباب کہتے ہیں محرومیت کی یہ مدّت محدود تھی۔ حالانکہ سوال یہ نہیں کہ محرومیت کی مدّت محدود تھی یا غیر محدود؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ مقدّر میں لکھے حکم سے محروم کیا ہی کیوں کیا گیا؟

اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے انہیں ارض مقدس سے محروم کر دیا گیا۔ کیونکہ جب انہوں نے قتال کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا **فاذهب انت وربّك فقاتلا انا ههُنا قاعدون** تو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی کی بنا پر اطلاع فرمادی کہ چالیس سال کے بعد اسرائیلی قتال کا حکم بجالا کر ارض مقدس میں سکونت اختیار کریں گے تب تک ارض مقدس سے محروم رہیں گے، چنانچہ چالیس سال کے بعد جب اسرائیلی حکمِ الٰہی بجالائے تب ارضِ مقدس کے فاتح بنے، محض چالیس سال کی دربدری کی مدت مکمل کرنے سے ارض مقدس کے مالک نہیں بنے۔ گویا ارضِ مقدس کا انعام اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کے ساتھ مشروط تھا، چنانچہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں زبور کا حوالہ دے کر فرمایا ہے کہ ارض مقدس کی وراثت کا استحقاق اپنے نیک بندوں کو بخشا ہے: **ولقد كتبنا في الزبور من بعد الذكر أن الارض يرثُها عبادي الصالحون** [(الانبیاء:۱۰۵) ترجمہ: اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے۔

یہود نے جس طرح قتال فی سبیل اللہ کا انکار کر کے اپنے استحقاق کو ختم کر دیا تھا اور چالیس سال کے بعد قتال کا حکم بجالا کر ارض مقدس کے مالک بنے تھے اسی طرح خاتمُ الأنبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر کے ارض مقدس کے اعزازی استحقاق سے محروم ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور محمد رّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی وجہ سے یہ امت کافرہ بن چکی ہے اور ارض مقدس سے ان کی محرومی مندرجہ بالا نص سے ثابت ہے۔ اس استدلال کو قیاسی بتلانا صریح مغالطہ ہے۔ یہود کے ابدی استحقاق پر کوئی صریح نص نہیں ہے مگر بالفرض اسے تسلیم کر بھی لیا جائے تو ان کے عزلِ استحقاق پر صریح نص موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو محض اس لیے اعزاز واکرام سے نوازے کہ وہ برگزیدہ لوگوں کی اولاد ہے۔ سنتِ الٰہیہ میں اعزاز واکرام کے وعدے ایمان کی

بنیاد پر ہوتے ہیں۔ نیز کتب اللّٰہ لکم کے ذریعے امر تکوینی کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ یہود کے لیے امر تشریعی نہیں ہے کہ وہ کفر کی حالت میں بھی اس سرزمین کو حاصل کرنے کے مکلّف ہوں کیونکہ ''کتب'' امر تشریعی کے لیے اس وقت ہوتا ہے جب اس کے صلہ میں ''علٰی'' ہو، جیسے کُتِبَ علیکم الصّیام (فرض کیا گیا تم پر روزہ) (البقرۃ:۱۸۳) کُتِبَ علیکم القتال (فرض ہوئی تم پر لڑائی (البقرۃ:۲۱۶) بالفرض امر تشریعی مان لیا جائے تب بھی یہ قابل استدلال نہیں کیونکہ شریعت محمدیہ شریعت موسوی کے لیے ناسخ کی حیثیت رکھتی ہے۔

چوتھا جواب:

اللہ تعالی نے حصولِ اولاد کے لیے فرمایا: وابتغوا مَا کتب اللہ لکم (اس اولاد کی کوشش کرو جو اللہ تعالی نے تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے۔ لیکن اس مقدر کے لکھے کو حاصل کرنے کے لیے تشریعی امور کا التزام ضروری ہے۔ وہ ہے شرعی نکاح کرنا جو دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص امر تکوینی سے استدلال کرتے ہوئے کسی اجنبیہ سے حصول اولاد کی کوشش کرے گا تو اس کی قسمت میں کوڑے اور سنگ ساری کی سزا ہے، اسی طرح یہود کے لیے کتب اللہ لکم سے ارض مقدس کا حصول ایمان اور عمل صالح کی تشریعی امور کے اہتمام پر موقوف ہے، اگر یہود محض امر تکوین سے استدلال کر کے ارض مقدس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کی قسمت میں ذلت و مسکنت کے عذاب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جس کی خبر اللہ تعالی نے دیتے ہوئے فرمایا: (ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤا بغضب من اللّٰہ)

یہود کی شامت اعمال سے جب رومی حملہ آور طیطوس (ٹائی ٹس) نے ارض مقدس پر حملہ کر کے یہود کو جلاوطن کر دیا، اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا: وإنْ عُدتُّم عُدنا (اگر تم پھر کفر وعصیان کی روش پر لوٹ آئے تو ہم تمہیں اسی طرح پھر عذاب میں دوچار کریں گے) یہود نے ان واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی بجائے تکذیب اور مخالفت پر اتر آئے اس لیے امّت محمدیہ ان کے لیے قہر الٰہی بن کر نازل ہوئی، اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کے ذریعے بھی کافروں کو عذاب دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: قاتلوھم یعذّبھم اللّٰہ بایدیکم (التوبۃ:۱۴) ''لڑو ان سے تا کہ عذاب دے اللہ ان کو تمھارے ہاتھوں سے'' پس یہود کا کفر وعصیان ارض مقدس سے محروم ہونے کی بنیاد ہے اور اس سے ان کو بے دخل کیا جانا وعدہ الٰہی کا تقاضاہ ہے جس کی تکمیل تشریعی طور پر اہل ایمان کے ذمہ ہے۔

پانچواں جواب:

اگر ارض مقدس پر یہود کا ابدی استحقاق استحقاق ہوتا تو پھر شام کی کنجیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دی جاتیں، اللہ

تعالی نے وہ کنجیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر اس کا مالک امت محمدیہ کو بنا دیا، چنانچہ عہدِ فاروقی میں اس سرزمین نے مسلمانوں کے فاتحانہ قدموں کا استقبال کیا۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ غزوہ خندق (کی کھدائی) کے موقع پر ایک سخت چٹان آڑے آ گئی، جس پر کدال اچٹ جاتی اور چٹان ٹوٹتی نہ تھی، ہم نے آپ سے شکوہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے کدال لی اور بسم اللہ کہہ کر ایک ضرب لگائی (تو ایک ٹکڑا ٹوٹ گیا) اور آپ نے فرمایا: ''اللہ اکبر مجھے ملکِ شام کی کنجیاں دی گئی ہیں واللہ میں اس وقت وہاں کے سنہرے محلوں کو دیکھ رہا ہوں'' یہ بشارت عہد فاروقی میں مکمل ہوئی، قرآن وسنت کی ان نصوص کو نظر انداز کر کے کتاب مقدس کے محرفہ مندرجات کو سامنے رکھ کر یہود کے دعوی استحقاق کی فکری عمارت کھڑی کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسرے استدلال پر ایک نظر

ارض مقدس پر قوم یہود کے حقِ تملیک کے لیے دوسرا استدلال اس آیت کریمہ سے پیش کیا جاتا ہے:

وأورثنا القوم الذين كانوا يُستَضعَفُونَ مشارق الارض ومغاربها الّتی بٰرکنا فيها (الاعراف:۱۳۷)

''اور وارث کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے مشرق اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم نے۔''

آیت کریمہ کے لفظ وراثت سے یہود کے دعوی حق تملیک کا استدلال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ لفظ آیت کریمہ میں فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ تعبیر محض عطائی الٰہی اور بلا مشقت نوازنے کے لیے استعمال ہوئی ہے، اس لفظ سے ابدی حق تملیک کی نکتہ آفرینی درست نہیں ہے کیونکہ یہی لفظ فرعون کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جسے اللہ نے ارض مصر کی وراثت سے نوازا تھا پھر اس سے چھین بھی لی تھی، چنانچہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو فرعون کے ظلم وستم پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

قال موسیٰ لقومه استعينوا بالله واصبروا إنّ الارض لله يورثها من يشاء من عباده والعاقبة للمتقين (الأعراف:۱۲۸)

''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، ساری زمین اللہ کی ملکیت میں ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا وارث بنا دیتا ہے اور اچھا انجام ایمان والوں کا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے امر تکوینی سے دنیاوی جاہ ومنصب سے جسے چاہے نوازتا رہتا ہے خواہ وہ کافر ہو یا مؤمن، ہاں

حسن انجام صرف اہل ایمان کا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک طرف اقتدار کے تکوینی ہونے کی طرف اشارہ فرمایا اور دوسری طرف اسرائیلیوں کو امید دلائی کہ یہ تکوینی فیصلہ تمہارے حق میں بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تمہیں اس کا وارث بنا کر اس کا اقتدار تم میں بھی منتقل کرسکتا ہے۔

چنانچہ سورت اعراف کی آیت کریمہ[**وأورثنا القوم الذين كانوا يستضعفون مشارق الارض ومغاربها الّتى بٰركنا فيها**] (الاعراف:۱۳۷) میں اور سورت دُخان کی آیت کریمہ[**وأورثنا ها قوماً اٰخرين**](الدخان:۲۸) میں اسی انتقال وراثت کا اعلان ہے۔وراثت کا لفظ تو تبدیلی ملک پر دلالت کرتا ہے۔چہ جائیکہ اس سے کسی قوم کی ابدی ملکیت کا حق ثابت ہو۔

نیز اگر حق ملکیت فرض کر بھی لیا جائے تو یہود کے لیے ارض مقدس کا استحقاق ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط تھا۔قرآنی بیان کے مطابق یہ شرط زبور میں بیان کی گئی تھی۔[**ولقد كتبنا فى الزبور أنّ الارض يَرِثُها من عبادى الصالحون**](الانبیاء:۱۰۵)(اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے)

یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جھٹلایا اور آپ کی جان کے درپے رہے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی رکھی،یہود کے یہ سارے کفریہ اعمال ان کو ارض مقدس کے اعزازی استحقاق سے محروم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد واضح ہوا کہ ان دو آیات میں کسی بھی طرح یہود کا حق تملیک ثابت نہیں ہوتا،ہاں یہود کے لیے یہ مقام فرحت ضرور ہوگا کہ ان کے دِل کی بات،اُن سے بہتر طریقے سے کرنے والے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہوچکے ہیں......**فإلى الله المشتكى !**۔

غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم　　　　اے جانِ وفا! یہ ظلم نہ کر

☆......☆......☆

امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ

(ولادت:۲۳۸-وفات:۳۳۳ھ)

مولانا مدثر جمال تونسوی

''اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کی کلامی تعبیرات کے اعتبار سے دو شاخیں شمار ہوتی ہیں: ایک شاخ ''اشاعرہ'' کہلاتی ہے، جبکہ دوسری شاخ ''ماتریدیہ'' کے نام سے معروف ہے۔ ماتریدی طرزِ کلام امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، جو کہ فقہ اور فروع میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پیروکار تھے، اس لیے عقائد اور کلام کی تعبیرات اور اسلوبِ بیان میں امام ماتریدی رحمہ اللہ فقہاء احناف کے کلامی ترجمان کے درجہ پر سمجھے جاتے ہیں، مگر آج کل بالعموم طلبہء علم امام ماتریدیؒ سے زیادہ متعارف نہیں ہوتے۔ درج ذیل مضمون میں امام ابومنصور ماتریدیؒ کے احوال ذکر کیے جارہے ہیں، ان شاء اللہ! یہ مضمون امام ماتریدیؒ کے تعارف کے لیے مفید ثابت ہوگا۔''

نام ونسب

محمد بن محمد بن محمود، کنیت ابومنصور، اور نسبت ''ماتریدی'' اور ''سمرقندی'' ہے۔ ''سمرقندی'' شہرِ سمرقند کی طرف نسبت ہے اور ''ماتریدی'' اُس بستی کی طرف نسبت ہے جہاں ان کی پیدائش ہوئی۔ بعض اہلِ علم مثلاً: علامہ بیاضی حنفیؒ نے آپ کا نسب مشہور صحابی حضرت سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچایا ہے، مگر دیگر کسی اور معتبر اور قدیم ماخذ سے اس کی تائید نہیں ہوسکی ہے۔

ماترید: میں تا پر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے اور فتح بھی یعنی: ماتُرید اور ماتَرید۔ جب کہ بعض لوگ ماتریت بھی پڑھتے ہیں۔ علامہ عبدالکریم السمعانیؒ نے اس محلے کی متعدد بار زیارت کی اور اس کے بارے میں اپنا یہ تبصرہ نقل کیا:

''قد تخرج منها جماعة من الفضلاء۔'' (الانساب للسمعانی، ص:۴۹۸)

''اس محلے سے فاضل اہلِ علم کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوئی ہے۔''

پھر یہی بات علامہ یاقوت حمویؒ نے ''معجم البلدان'' میں اور علامہ ابن الاثیر الجزریؒ نے ''اللباب'' میں بھی نقل کی ہے۔

جب کہ سمرقند ماوراء النہر کے مشہور ترین قدیم شہروں میں سے ایک ہے۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق اسکندر مقدونی نے اپنے زمانے میں اس کی تعمیرِ نو کی تھی، اور بعض سیاح مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے:

''کل ما سمعت عن محاسنها صحیح باستثناء انها اجمل مما تصورت۔''

''اس شہر کی خوبصورتی کے بارے میں جو کچھ بھی سنا تھا سب صحیح ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی خوبصورتی میرے تصور سے بھی زیادہ تھی۔''

ولادت

امام ماتریدی رحمہ اللہ کی ولادت کے بارے میں محققین کا راجح قول سنہ ۲۳۸ھ کا ہے۔

اساتذہ

امام ماتریدیؒ نے چونکہ ایک ایسے علاقے میں آنکھ کھولی جو علم وفقہ کی سرگرمیوں سے خوب آباد تھا، خصوصاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سلسلے کے علماء کرام وہاں بکثرت تھے اور اپنی علمی تگ ودو سے پورے علاقے کو روشن کیے ہوئے تھے تو یہ وہ ماحول تھا جس نے امام ماتریدیؒ کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بہترین اساتذہ کی بدولت درجہ امتیاز عطا کر دیا تھا اور آپ کی علمی کاوشوں نے آگے چل کر ایسی مقبولیت حاصل کی کہ بالعموم علمائے احناف نے عقائد کے مباحث ومسائل اور تحقیقاتی اسلوب میں انہی کی پیروی کی اور یوں علمائے ماتریدیہ اہلِ سنت والجماعت کا ایک علمی ترجمان حلقہ بن کر تاریخی حقیقت بن گیا۔

امام ماتریدی رحمہ اللہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کتابوں کو خصوصاً عقائد سے متعلق رسائل کو اپنے اساتذہ کے توسط سے سندِ متصل کے ساتھ روایت کرنے والے اور ان کی ترویج واشاعت کرنے والے ہیں، چنانچہ امام ماتریدیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے عقائد سے متعلق رسائل: ''**الفقہ الابسط، رسالۃ إلٰی عثمان البتی، العالم و المتعلم**، یوسف بن خالد کے نام وصیت'' کو اپنے شیخ ابونصر احمد بن عباس العیاضیؒ، شیخ احمد بن اسحاق الجوزجانیؒ اور شیخ نصیر بن یحیٰ البلخیؒ سے روایت کیا ہے اور یہ تینوں شیوخ ان کتابوں کو اپنے شیخ ابوسلیمان الجوزجانیؒ سے روایت کرتے ہیں اور شیخ ابوسلیمان الجوزجانیؒ روایت کرتے ہیں اپنے شیخ محمد بن حسن شیبانیؒ سے اور امام محمدؒ انہیں روایت کرتے ہیں امام اعظم ابوحنیفہؒ سے۔

یہ سندِ متصل اس بات کی دلیل اور شاہد ہے کہ امام ماتریدی رحمہ اللہ نے عقائد کے مسائل ومباحث اور اسلوبِ تحقیق میں جو بھی کاوشیں کی ہیں ان کی بنیاد واساس وہی فکر ہے، جس کی بنیاد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے رکھی، اور امام ابوحنیفہؒ کے حالات پر نظر رکھنے والوں سے یہ مخفی نہیں کہ جس طرح آپ فقہ کی تاسیس رکھنے والے ہیں، اسی طرح گمراہ فرقوں کے ظہور کی وجہ سے اہلِ سنت والجماعت کی ترجمانی کرتے ہوئے عقائد کے مباحث ومسائل کو بھی ایک مستقل

علم وفن کی حیثیت دینے والے ہیں، اگرچہ آپ پر بعدازاں فقہ کا رنگ غالب آ گیا اور یہی چیز آپ کی پہچان بن گئی اور عقائد والی مباحث کو پھر آپ کے شاگرد درشاگرد امام ماتریدی رحمہ اللہ نے پوری توجہ سے بڑھایا اور اسی سبب سے پھر یہ علمی نسبت امام ابوحنیفہؒ کے بجائے امام ماتریدیؒ کی طرف ہوگئی۔ واللہ اعلم

مشہور اساتذہ

امام ماتریدی رحمہ اللہ نے چند نامور اساتذہ کرام کا مختصر تذکرہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

۱:... امام محمد بن مقاتل الرازی رحمہ اللہ

علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے ''الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ'' میں آپ کو امام ماتریدیؒ کے اساتذہ میں ذکر کیا ہے۔

آپ ایک فقیہ بھی تھے اور محدث بھی، اور دیگر علومِ اسلامیہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ علمِ حدیث امام وکیع بن الجراحؒ اور ان کے طبقے کے دیگر اہلِ علم سے حاصل کیا تھا۔ علامہ کمال پاشاؒ نے آپ کے حالات لکھے ہیں اور اس میں یہ صراحت کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے عقائد میں جو شاگرد اور ان کا سلسلہ چلا ہے، تو یہ اس میں چوتھے طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ایک مدت تک ''رے'' کی قضا کے منصب پر فائز رہے۔

آپ کی وفات کے بارے میں دو قول ہیں: ایک قول کے مطابق وفات ۲۴۲ھ میں ہوئی جب کہ راجح یہ ہے کہ ان کی وفات سنہ ۲۴۸ھ میں ہوئی، قریبی زمانے کے نامور محقق عالم دین شیخ محمد زاہد الکوثریؒ نے اسی کو ذکر کیا ہے اور اسے ہی راجح قرار دیا ہے۔ (مقدمۃ العالم والمتعلم)

۲:... اِمام اَبونصر احمد العیاضی رحمہ اللہ

آپ امام ماتریدیؒ کے اُن اساتذہ میں سے ہیں، جن سے آپ کو خصوصی تعلق تھا، چنانچہ شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ محدث قاسم بن قطلو بغا نے آپ کے اساتذہ میں سے صرف انہی کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر تمام طبقاتِ حنفیہ میں بھی امام ماتریدیؒ کے اساتذہ میں ان کا نام شامل ہے۔ علامہ محمد مرتضیٰ زبیدیؒ نے بھی امام ماتریدیؒ کے اساتذہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور آپ کا نسب اس طرح بتایا ہے:

''احمد بن عباس بن حسین بن جبلۃ بن جابر بن نوفل بن عیاض بن یحیٰی بن قیس بن سعد بن عبادۃ الانصاری الفقیہ السمرقندی۔''

اس نسب سے واضح ہوتا ہے کہ آپ مشہور صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے خاندان سے تھے۔

آپ نے علاقہ ماوراء النہر کے معروف حنفی فقیہ شیخ ابوبکر احمد بن اسحاق جوزجانیؒ سے علم حاصل کیا تھا۔ موصوف حددرجہ بہادر اور جرات مند تھے۔ جہاد میں بے دریغ شریک ہوتے تھے اور پھر اسی راہِ جہاد میں احمد بن اسد بن سامان کے عہدِ ولایت میں ایک معرکے میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ علم وفضل میں اس قدر بلند مرتبہ رکھتے تھے کہ علماء سیر نے یہاں تک تحریر کیا:

''إن الدليل علٰى صحة مذهب ابى حنيفة كون الإمام احمد العياضى علٰى مذهبه۔''

(ذیل الجواہر المضیئۃ لابن ابی الوفاء، ج:۲،ص:۵۶۲)

''امام احمد العیاضیؒ جیسے شخص کا امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر ہونا، امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔''

۳:... ابوبکر احمد بن اسحاق الجوزجانی رحمہ اللہ

علامہ عبدالحی لکھنویؒ، علامہ تمیمیؒ اور علامہ زبیدیؒ سب نے ان کو امام ماتریدیؒ کے اساتذہ میں ذکر کیا ہے اور سب نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ:

''كان عالمًا جامعًا بين الاصول و الفروع و قد اخذ العلم عن ابى سليمان الجوزجانى۔''

''موصوف ایک بڑے عالم اور اصول وفروع دونوں میں مہارت رکھتے تھے اور (امام محمد کے نامور شاگرد) امام ابو سلیمان الجوزجانیؒ سے علم حاصل کیا تھا۔''

ان کی دو کتابوں کے نام ملتے ہیں:۱:-الفرق والتمییز ،۲:-کتاب التوبۃ۔

۴:-نصیر بن یحییٰ البلخی رحمہ اللہ

''اتحاف السادۃ المتقین فی شرح إحیاء علوم الدین'' میں علامہ زبیدیؒ نے انہیں امام ماتریدیؒ کے اساتذہ میں ذکر کیا ہے۔ ابومطیع حکم بن عبداللہؒ، ابومقاتل حفص بن مسلم السمرقندیؒ اور ابوسلیمان الجوزجانیؒ آپ کے شیوخ میں سے ہیں۔ موصوف فقہ حنفی اور علم کلام میں ماہر تھے اور سنہ ۲۶۸ھ میں وفات پائی۔

علمی مقام ومرتبہ

امام ماتریدی رحمہ اللہ کا علمی مقام ومرتبہ تین باتوں سے سمجھا جاسکتا ہے:

۱:-آپ کی تالیفات ۲:-آپ کے شاگردوں اور استفادہ کنندگان کا سلسلہ

۳:-سیرت نگار علماء ومحققین کی طرف سے آپ کے لیے ذکر کیے گئے القاب۔

پہلے ہم تیسرے نکتے کو ذکر کرتے ہیں، چنانچہ سیرت نگاروں نے آپ کے لیے جو القاب ذکر کیے ہیں وہ سب کے سب آپ کے بلند پایہ علمی مقام اور درجہ اِمامت کو واضح کررہے ہیں، چنانچہ درج ذیل تین القابات دیکھئے:
''۱:-اِمَامُ الهُدیٰ ،۲:-اِمَامُ الْمُتَکَلِّمِیْن ،۳:-مُصَحِّحُ عَقَائِدِ الْمُسْلِمِین'' (مسلمانوں کے عقائد کو درست کرنے والے)۔

جب کہ آپ کی تالیفات کی عمدگی اور کمال کی گواہی دینے والے سب ہی وہ علماء ہیں جنہوں نے آپ کی تالیفات دیکھیں، اور ان کا مطالعہ کیا، چنانچہ اب بھی جو کتابیں خاص کر آپ کی ضخیم تفسیر بنام ''تاویلات اہل السنۃ'' اور علم التوحید پر ضخیم اور دقیق کتاب بنام ''کتاب التوحید'' شائع ہو چکی ہیں اور عرب وعجم کے اہلِ علم کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ خصوصاً ''تفسیر ماتریدی'' کو متعدد اہلِ علم نے اپنی تحقیق کی جولانگاہ بنایا ہے اور اس کے متعدد تحقیقی ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں، شنید ہے کہ پاکستان کے بعض ادارے اس کے اردو ترجمے کی طرف بھی پیش رفت کر چکے ہیں۔

علامہ بیاضی حنفیؒ آپ کی تالیفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''و حقق فی کتبه المسائل بقواطع الادلة و اتقن التفاريع بلوامع البراهين اليقينية ۔''

(اِشارات المرام، ص:۲)

''امام ماتریدیؒ نے اپنی کتابوں میں مسائل کو قطعی دلائل سے پایہ تحقیق کو پہنچایا ہے اور تفریعات کو روشن براہین سے مستحکم کر دیا ہے۔''

یہ بات محققین کے لیے بہت ہی واضح اور کافی ہے جب کہ عام آدمی کے لیے یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ عالم اسلام کے مایہ ناز اور قدیم ترین علمی وتعلیمی ادارے: مصر کا جامعہ الازہر، مغرب کا جامعہ الزیتونہ اور جامع القرویین، ماوراء النہر کے علمی ادارے اور پاک وہند وافغانستان کے تعلیمی اداروں میں صدیوں سے امام ماتریدیؒ کے اسلوبِ فکر والے عقائد کو درسی نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے اور جلیل القدر علمائے کرام انہیں پڑھتے اور پڑھاتے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ عقیدہ نسفیہ جو ماتریدی اُسلوبِ فکر کا نمائندہ اور مختصر ترین رسالہ ہے اور اس کی شرح جو علامہ ثانی سعدالدین التفتازانیؒ نے تحریر کی ہے، وہ اوپر ذکر کردہ دینی جامعات میں داخل نصاب رہی ہے یا درسی نصاب میں بطور معاون کتاب کے پڑھی اور پڑھائی جاتی رہی ہے۔

امام ماتریدیؒ کے تلامذہ

امام ماتریدیؒ کی علمی سرگرمیوں اور علمی مقام دونوں سے واقفیت کے لیے ان کے تلامذہ پر بھی ایک نظر ہونی

چاہیے۔اس لیے ذیل میں ان کے چند نامور تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱:-ابوالقاسم السمر قندی رحمہ اللہ

اپنے وقت میں علم فقہ اور علم کلام امام ماتریدیؒ سے حاصل کیا اور بلخ کے مشائخ سے علمِ تصوف حاصل کیا اور اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ ''الحکیم'' ان کا لقب پڑ گیا۔سمرقند کے قاضی بھی مقرر ہوئے اور اچھی سیرت وکردار کے مالک تھے۔سمرقند میں سنہ ۳۴۲ھ میں وفات پائی۔دو کتابیں یادگار چھوڑیں:''**الرد علی اصحاب الھوی**''،اور ''**کتاب الإیمان جزء من العمل**''۔

۲:-شیخ علی الرستغنی رحمہ اللہ

ابوالحسن علی بن سعد الرستغنیؒ ان کا پورا نام ہے۔سیرت نگاروں نے آپ کو امام ماتریدیؒ کے جلیل القدر تلامذہ میں بتلایا ہے۔یادگار کتابوں میں ''ارشاد المہتدی'' اور ''الزوائد والفوائد فی انواع العلوم'' کے نام ملتے ہیں۔

۳:-ابومحمد عبدالکریم بن موسیٰ البزدوی رحمہ اللہ

آپ علمائے حنفیہ میں سے دو مشہور شخصیات: امام ابوالعسر البزدویؒ اور امام ابوالیسر البزدویؒ کے دادا ہیں۔یہ پورا خاندان علمی خاندان ہے،سنہ ۳۹۰ھ میں وفات پائی۔

امام ماتریدی رحمہ اللہ کی وفات

آپ کی وفات میں اہلِ علم کا تھوڑا سا اختلاف ہے،مگر جو راجح ہے وہ سنہ ۳۳۳ھ ہے اور آپ کی قبر سمرقند میں ہے اور مشہور ہے۔

امام ماتریدی رحمہ اللہ کی زندگی کے عمومی نقوش

امام ماتریدیؒ کے زمانے میں ماوراء النہر کے علاقے میں جو گمراہ فرقے تھوڑی یا زیادہ تعداد میں موجود تھے،ان میں سے تین قابل ذکر ہیں: معتزلہ،شیعہ اور کرامیہ،جب کہ غیر مسلموں میں سے فلاسفہ کی کتب کے عربی تراجم ہونے کی وجہ سے ان کا نام بھی عالم اسلام میں کافی گونج رہا تھا۔چنانچہ امام ماتریدیؒ نے ان سب کے خلاف اہلِ سنت کی ترجمانی اور دفاع کا محاذ سنبھالا اور اسی لیے ''امام الہدیٰ'' ان کا لقب قرار پایا۔اسی لیے ''تفسیرِ ماتریدی'' کا مطالعہ کرنے والا جابجا اس حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے کہ امام ماتریدیؒ بڑی وضاحت وصراحت اور قوت کے ساتھ ان گمراہ فرقوں کی تردید کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا مقام ہو جہاں ان فرقوں کی تردید کی نوبت آئے اور امام ماتریدیؒ خاموشی سے گزر جائیں۔امام ماتریدیؒ کی تفسیر گویا اس حوالے سے منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ آپ نے آیاتِ قرآنیہ کی

تفسیر وتاویل میں اہلِ سنت کے نظریے کو بھی بیان کیا ہے اور ساتھ ساتھ گمراہ فرقوں کے نظریات اور ان کی تردید کو بھی سامنے رکھا ہے، اس طرح یہ عظیم کتاب "تقابلی مطالعے" کا ایک بہترین اور شاہکار نمونہ قرار پاتی ہے اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تقابلی مطالعے کا ایک بہترین اور شاہکار نمونہ قرار پاتی ہے اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تقابلی مطالعے کی روایت عصرِ حاضر میں پڑی ہے اور متقدمین اہلِ علم اس ضروری پہلو سے ناواقف تھے، ان کی غلط فہمی بھی اس کے بعد دور ہو جانی چاہیے۔

تالیفات

۱:-تاویلات اہل السنۃ......جو "تفسیرِ ماتریدی" کے نام سے بھی مشہور ہے۔اس تفسیر میں امام ماتریدیؒ کے طرزِ تفسیر کو درج ذیل نکات میں دیکھا جا سکتا ہے:

تفسیر القرآن بالقرآن: چنانچہ امام ماتریدیؒ کے ہاں اس کا خاص اہتمام نظر آتا ہے کہ آپ جہاں ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت میں دیکھتے ہیں یا دونوں کے مقاصد کو یکجا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف ضرور رہنمائی فرما دیتے ہیں۔

تفسیر القرآن بالسنۃ النبویۃ: امام ماتریدیؒ کی زندگی میں اگرچہ علم حدیث سے بہت زیادہ لگاؤ کا سراغ نہیں ملتا، کیوں کہ آپ کے حالاتِ زندگی بہت ہی کم دستیاب ہیں، مگر تفسیر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس احادیث وآثار کا بھی کافی ذخیرہ موجود تھا، چنانچہ راقم السطور نے ملاحظہ کیا تو کم وبیش ہر صفحے دو صفحے بعد متعدد احادیث وآثار مل جاتے ہیں۔

تفسیر القرآن باللغۃ العربیۃ: متعدد مقامات پر نہایت اہتمام کے ساتھ نحوی اور صرفی کے حوالے سے لغات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کئی مقامات پر اس مقصد کے لیے باقاعدہ عربی اشعار بھی بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔

فقہی اختلافات کا بیان: اگرچہ امام ماتریدیؒ نے اس موضوع کا زیادہ اہتمام نہیں کیا، مگر پھر بھی جہاں ضرورت محسوس ہوئی کہ فقہ حنفی کا استدلال واضح کیا جائے، وہاں فقہ حنفی کے استدلال اور اس کی ترجیح کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور کئی مقامات پر بعض ایسے فقہی استدلالات پیش کیے ہیں جو دیگر متداول کتب میں کم ہی نظر آتے ہیں۔

گمراہ فرقوں کی تردید: یہ تو امام ماتریدیؒ کا خاص موضوع ہے، چنانچہ کسی بھی آیت سے اگر معتزلہ نے، یا کرامیہ نے، یا باطنیہ نے، یا فلاسفہ نے، یا روافض نے کوئی استدلال کیا ہے تو امام ماتریدیؒ ان کے استدلال کے غلط ہونے کو واضح کرتے ہیں اور پھر جن جن قرآنی آیات سے ان کے نظریات کا باطل ہونا معلوم ہوتا ہے، وہاں بھی اس پر پوری پوری تنبیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

تفسیر کا مجموعی انداز قدرے دقیق ہے، مگر تسلسل سے مطالعہ کیا جائے تو انداز واسلوب سمجھ آجانے کے بعد استفادہ کافی آسان سے آسان تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ تفسیر متعدد محققین کی تحقیق سے شائع ہوچکی ہے۔ راقم السطور کے پاس اس کا وہ نسخہ ہے جو پانچ جلدوں میں ہے اور محترمہ فاطمہ یوسف الخیمی کی تحقیق سے شائع ہوا ہے۔

اس تفسیر کے بارے میں علامہ عبدالقادر القرشیؒ نے ''الجواہر المضیئۃ'' میں جو تبصرہ کیا ہے وہ قابلِ ذکر ہے اور اس کتاب کی اہمیت پر پورا پورا شاہد ہے:

''**بانہ کتاب لایوازیہ فیہ کتاب بل لایدانیہ شیء من تصانیف من سبقہ فی ذلک الفن۔**''

(الجواہر المضیئۃ، ج:۲، ص:۱۳۰)

''یہ ایسی کتاب ہے کہ کوئی اور کتاب اس کی ہم پلہ نہیں، بلکہ سابقین کی کوئی کتاب اس کے قریب بھی نہیں پہنچ پاتی۔''

جب کہ علامہ محمد زاہد بن حسن الکوثریؒ کا تبصرہ یہ ہے:

''**کتاب لانظیر لہ فی بابہ۔**'' (مقدمۃ اشارات المرام، ص:۷)

''اس باب میں اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔''

۲:- کتاب الجدل ۳:- ماخذ الشرائع

یہ دونوں کتابیں اُصولِ فقہ پر ہیں، اور بعض اہلِ علم کے مطابق چھٹی صدی ہجری تک علمائے احناف کے ہاں یہ کتابیں مروج رہیں، بعد میں جب پانچویں صدی ہجری میں ابوزید عمر الدبوسیؒ کی ''تقویم الادلۃ''، فخر الاسلام بزدویؒ کی ''کنز الاصول فی معرفۃ الاصول'' اور شمس الائمہ سرخسیؒ کی ''کتاب الاصول'' سامنے آئیں تو تسہیل وترتیبِ جدید وغیرہ کے پیشِ نظر یہ کتابیں مقبول ہوگئیں اور دقت وپیچیدگی کی وجہ سے امام ماتریدیؒ کی کتابیں پردہ خفا میں چلی گئیں۔ (کشف الظنون للحاجی خلیفہ، ج:۱، ص:۱۱۰)

چنانچہ اب بھی علمائے حنفیہ کی اصولی کتب میں اور پھر خود امام ماتریدیؒ کی تفسیر میں کئی مقامات پر اصولِ فقہ کی مباحث موجود ملتی ہیں، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ امام صاحبؒ فقط علم کلام اور علم عقائد کے ہی ماہر نہ تھے، بلکہ اصولِ فقہ میں بھی ان کا اپنا خاص اور منفرد مقام تھا اور بعض مستقل آراء تھیں۔

۴:- کتاب التوحید

امام ماتریدیؒ نے عقائد کے باب میں خصوصاً الٰہیات کے باب میں یہ کتاب تحریر کی ہے اور اس کا نام ''کتاب التوحید'' رکھ کر یہ واضح کیا ہے کہ دینِ اسلام کا اساسی پیغام توحید ہے اور دینِ اسلام سے باہر کے فرقے ہوں، مثلاً:

فلاسفہ وثنویہ اور مانویہ وغیرہ یا اسلام کے اندر موجود گمراہ فرقے ہوں، وہ سب کے سب ابتدائی طور پر جوٹھو کر کھاتے ہیں، وہ اسی توحید کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہوتی ہے۔

اسی لیے اس کتاب میں مصنف نے صرف اسلام کے نظریہ توحید کو بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ دیگر ادیان اور گمراہ فرقوں کے مقالات کی تردید کو پیشِ نظر رکھا ہے، اسی لیے اس کتاب میں ان فرقوں کے مقالات بھی کافی مقدار میں سامنے آجاتے ہیں، چنانچہ حافظ ابن عساکرؒ ''تبیین کذب المفتری'' میں لکھتے ہیں:

''إن مقالات تلک الفرق مبسوطة فی کتب الاشعری و الماتریدی و الاسفرائینی۔'' (تبیین کذب المفتری، ص:۲۰)

''ان فرقوں کے اَقوال امام اشعریؒ، امام ماتریدیؒ اور امام اسفرائینیؒ کی کتابوں میں تفصیل سے موجود ہیں۔''

اس کتاب میں امام ماتریدیؒ نے جو مباحث ذکر کی ہیں، وہ درج ذیل ہیں: نظریہ معرفت کی وضاحت، عقیدہ اُلوہیت کی اہمیت اور اس کے دلائل، دہریہ کا رد، سمنیہ کا رد، سوفسطائی کا رد، ثنویہ کا رد، دیصانیہ کا رد، مرقونیۃ کا رد، مسئلہ قضاء وقدر کی بحث، مسئلہ ایمان کی بحث، مسئلہ شفاعت اور مسئلہ ارجاء کی بحث، ایمان اور اسلام کی بحث۔

اس کتاب کے بارے میں امام ابوالیسر البزدویؒ کا یہ تبصرہ قابلِ توجہ ہے:

''إن بہٖ قلیل انغلاق و تطویلا و فی ترتیبہٖ نوع تعسیر و إنہٗ لولا ذٰلک لاکتفینا بہٖ۔''
(اصول الدین لابی الیسر البزدوی)

''اس کتاب میں قدرے پیچیدگی، طوالت اور ترتیب بھی کچھ مشکل ہے، اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو ہم اسی کتاب کو کافی سمجھتے (اور خود سے اس موضوع پر کوئی کتاب تحریر نہ کرتے)۔''

امام ماتریدیؒ کی اس کتاب اور اس موضوع سے متعلق آراء وافکار کی اہمیت کا اس سے بھی اندازہ لگائیے کہ علامہ ابن الہمامؒ کی ''المسایرۃ''، ''العقیدۃ النسفیۃ'' اور اس کی شروحات، علامہ بیاضی حنفیؒ کی ''اِشارات المرام''، علامہ ابوالیسر بزدویؒ کی ''اصول الدین'' حافظ ابوالبرکات نسفیؒ صاحب کنز الدقائق کی کتاب ''العقیدۃ''، وغیرہ میں امام ماتریدیؒ کے اسلوب کی پیروی کی گئی ہے اور ان کی آراء کو اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عصرِ حاضر میں ترکی کے ایک محقق کی کاوش سے شائع ہو کر عرب وعجم میں اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بن چکی ہے۔ الحمدللہ!

۵:- شرح الفقہ الاکبر

اس نام سے چونکہ امام ماتریدیؒ کی طرف کتاب منسوب ہو کر شائع ہوئی ہے، اس لیے اس کا ذکر کر دیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب امام ماتریدیؒ کی تالیف نہیں ہے اور کہیں بھی سیرت نگاروں نے اس نام کی کتاب ان کی

طرف منسوب نہیں کی۔عصرِ حاضر میں جس ادارے نے بھی اسے شائع کیا ہے، انہیں یقیناً اس بارے میں کوئی سہواور غلط فہمی ہوئی ہے۔ بلکہ حقیقت میں یہ کتاب امام ابواللیث سمرقندیؒ (متوفیٰ:۳۷۳ھ) کی تالیف ہے۔امام زاہدالکوثریؒ اورامام محمدابوزہرہؒ کی یہی تحقیق ہے،اس لیےاہلِ علم اس نکتے پرمتنبہ رہیں۔

۶:-مقالات الماتریدی رحمۃ اللہ علیہ

اس کتاب میں بھی امام صاحبؒ نے مختلف فرقوں کےنظریات کا جائزہ پیش کیا ہے۔علامہ طاش کبری زادہؒ،علامہ بغدادیؒ، علامہ عبدالقادرالقرشیؒ، علامہ مرتضیٰ زبیدیؒ اورعلامہ عبدالحی لکھنویؒ نے امام ماتریدیؒ کی تالیفات میں اس کتاب کا ذکرکیا ہے۔

۷:-الدررفی اصول الدین

''کشف الظنون''اور''ہدیۃ العارفین''میں اس کا ذکرملتا ہے۔

۸:-العقیدۃ الماتریدیۃ

''ہدیۃ العارفین''میں اس کا ذکرملتا ہے،مگرعلماء کی رائے یہ ہے کہ یہ عقیدہ ان کی طرف منسوب کردیا گیا ہے،ان کی تالیف ہےنہیں۔

۹:-بیان وہم المعتزلۃ

''کشف الظنون،مفتاح السادۃ،ھدیۃ العارفین''اور''الجواہرالمضیئۃ''وغیرہ میں اس کا ذکرملتا ہے،مگرغالب گمان یہ ہے کہ یہ کتاب بھی اب مفقود ہے۔

۱۰:-ردّتہذیب الجدل

علامہ طاش کبری زادہؒ،حاجی خلیفہؒ،اوراسماعیل باشاؒ نے اس کا ذکرکیا ہے۔ابوالقاسم الکعبی المعتزلی (متوفیٰ:۳۱۹ھ) نے''تہذیب الجدل''کے نام سے کتاب لکھی تھی، یہ اسی کتاب کا ردہےاوراب یہ کتاب بھی مفقود ہے۔

۱۱:-ردّوعیدالفساق

یہ کتاب بھی ابوالقاسم الکعبی المعتزلی کی کتاب''وعیدالفساق''کا ردّہے۔یہ کتاب بھی مفقود ہے۔

۱۲:-ردّاوائل الادلۃ

یہ کتاب بھی ابوالقاسم الکعبی المعتزلی کی کتاب''اوائل الادلۃ''کا ردّہے،اوراب مفقود ہے۔

۱۳:-ردّالاصول الخمسۃ

''الاصول الخمسۃ''ابومحمدالباہلی (متوفیٰ ۳۰۰ھ) کی کتاب تھی،جس کا امام ماتریدیؒ نے ردلکھا۔

۱۴:-الردّ علی القرامطۃ

۱۵:-الردّ علی فروع القرامطۃ

۱۶:-ردّ الامامۃ۔(یہ کسی رافضی کی کتاب ''الامامۃ'' کا رد ہے)

۱۷:-وصایا ومناجاۃ (فارسی زبان میں ہے)

۱۸:-رسالۃ فیما لا یجوز الوقوف علیہ فی القرآن

یہ آخری سب کتابیں بھی مفقود ہیں۔

اختتامیہ

امام ماتریدیؒ کی حیات وخدمات کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر مستقل اور مفصل کام ہو، اور دوسروں کو تو چھوڑیئے ہم خود اور ہمارے اکابر جن کی طرف اپنی نسبت فخر سے فرمایا کرتے تھے تو ان کا حق بنتا ہے کہ ہم ان کے علوم وفیوض سے خود بھی مستفید ہوں اور دیگر طالبانِ علم کے سامنے بھی ان کے علوم وفیوض کا خوان پیش کریں۔ یہ بات اگرچہ کسی حد تک بجا ہے کہ اب تک امام ماتریدیؒ کے اصل علمی خزائن مخطوطات کی شکل میں محدود تھے اور ان سے استفادہ آسان نہ تھا، مگر اب جب کہ آپ کی دو اہم ترین کتابیں: تفسیر اور کتاب التوحید شائع ہوچکی ہیں، تو ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے اور امام ماتریدیؒ کی علمی آراء اور نظریاتی تحقیقات کو سامنے لایا جائے۔

امام ماتریدیؒ کی فکر کے اعتدال اور جامعیت کا نمونہ دیکھنے کے لیے ''کتاب التوحید'' میں ذکر کردہ ان کا یہ ضابطہ دیکھ لیا جائے جو اُن کی فکر میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے، فرماتے ہیں:

''**اصل ما یعرف به الدین وجهان: احدهما السمع والآخر العقل۔**'' (کتاب التوحید، ص:۴)

''دین جن طریقوں سے پہچانا جاتا ہے اس کی اصل دو چیزیں ہیں: ۱: شریعت، ۲: عقل۔''

اب آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ بندہ ناچیز کی یہ سطور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اپنے بندے ابومنصور ماتریدیؒ کو ان کی علمی ودینی خدمات کا اجر عظیم عطا فرمائے اور ان کی ان خدمات کو ان کے لیے تا قیامت صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین برحمتک یا ارحم الراحمین!۔

☆.....☆.....☆

طالب علم کو آداب کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے

الشیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ

ترجمہ: مولوی سعد اللہ سعدی

ادب ان چند کلمات میں سے ایک ہے جو پورے اسلام کے احکامات کو شامل ہے۔ مثلاً امانت: جس کا مختصر مفہوم ہے دیانت داری سے کام لینا۔ حقیقت میں اس کا مفہوم انتہائی وسیع ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ (سورۃ الاحزاب:۷۲)

''ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی۔''

یہاں امانت سے مراد مکمل اسلام ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امانت دین کے تمام امور کو شامل ہے۔ جمہور کا قول بھی یہی ہے۔ (تفسیر قرطبی:۱۴/۲۵۳)

اسی طرح لفظ عدل: جس کا مختصر معنیٰ ہے انصاف کرنا۔ یہ ظلم کی ضد ہے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم بہت کشادہ ہے۔ جیسے ابن عربی نے اس آیت: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (سورۃ النحل:۹۰)

''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو (ان کے حقوق) دینے کا حکم کرتا ہے۔'' کی تفسیر میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔

ادب کی اقسام: ان الفاظ میں سے ایک ادب ہے، جس کا معنیٰ ومفہوم بہت وسیع ہے۔ ادب مختلف اقسام پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھے آداب کا رویہ رکھنا (یعنی عبادات میں اخلاقی رویہ اختیار کرنا وغیرہ) تمام مخلوقات کے آداب کا خیال رکھنا، جیسے انبیاء کرام کا عزت وتکریم کے ساتھ تذکرہ کرنا، فرشتوں کا نام لیتے ہوئے آداب واخلاق بجالانا، اسی طرح انسان کا اپنے نفس کے ساتھ آداب کا خیال رکھنا، اپنے والدین کے ساتھ اخلاقی برتاؤ کرنا، بلکہ ہر وہ شخص جو تھوڑی دیر کے لیے آپ کا مصاحب بنے اس کے آداب کا خیال رکھنا بھی ضرور ہے۔

طالب علم کس کے آداب بجالائے؟

ہر انسان پر ان تمام کا ادب ضروری ہے جن کے حقوق اس پر لازم ہیں، سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے، اس عظیم منعم کا شکر بجالانے کے ساتھ آداب بجالانا بھی ضروری ہے، جنہوں نے لاتعداد انعامات واحسانات انسان پر کیے ہیں۔ عدم سے وجود بخشنے سے لے کر آج تلک حیات جاودانی کے ہر ہر منٹ وسیکنڈ میں انعامات بارش کی طرح

برستے ہیں۔طفولیت کے عجز سے شباب کی قوت تلک اور جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے علم کا لامتناہی سلسلہ عطا کرنے تلک،غرض یہ تمام انعامات گننے کے لیے ایک اور زندگی بھی کافی نہیں۔

اسی طرح انبیاء کرام جو رشد وہدایت کے آفتاب بن کر عالم ظلمات پر طلوع ہوئے۔اسی طرح فرشتے جو وجود عالم سے لے کر فنائے جہانِ فانی تک ابنِ آدام کی خدمات پر مامور ہیں، جوان نورانی مخلوق کے آداب بجانہ لائے تو وہ اس دنیا میں سانس لینے کا بھی حق دار نہیں۔اس کے علاوہ والدین اور اساتذہ کے آداب بجالانا جو زندگی کے ہر ہر موڑ پر راہنماء ومقتدا ثابت ہوئے ہیں۔یہاں صرف استاذ اور مربی کے آداب ذکر کیے جائیں گے۔

استاذ اور مربی کے آداب:

استاذ کے ساتھ حسن سلوک کرنا، بہترین اخلاقی برتاؤ کرنا ہر موقع پر انتہائی اہم ہے۔یہی فلاح وکامیابی کی ضمانت ہے۔استاذ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کے ساتھ آداب واخلاق سے پیش آئے۔علامہ مناوی کہتے ہیں:

''امام برہان بقاعی سے کسی نے سبق پڑھنے کی اجازت مانگی انہوں نے اجازت دی، جب وہ پڑھنے آئے تو چار زانو ہوکر بیٹھ گئے، امام بقاعی نے کہا جاؤ:تم پہلے ادب سیکھ کر آؤ، آپ کو علم حاصل کرنے سے پہلے ادب کی ضرورت ہے۔''(فیض القدیر:۱/ 225/1)

خطیب بغدادی نقل کرتے ہیں:

''علی بن صالح اور حسن بن صالح دونوں جڑواں بھائی تھے۔علی صرف ایک گھنٹہ حسن سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔حسن اپنے بھائی علی کی عزت وتوقیر کا خیال رکھتے تھے۔وہ اسے ابومحمد کہہ کر پکارتے، اتنی عزت کرتے کہ نام تک نہیں لیتے تھے۔جب علی بیٹھ جاتے تھے تو حسن اس کے ساتھ نہیں بیٹھتے بلکہ نیچے بیٹھ جاتے تاکہ بے ادبی کا مرتکب نہ ہو۔''(۲/ ۴۱۸)

اگر کوئی اپنے نفس کی تربیت اس انداز سے کرے تو وہ اخلاق وآداب کے اعلیٰ اوصاف کے ساتھ متصف ہوگا۔ اگر کوئی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسے آداب اپنائے کہ اپنے استاذ کے گھر کی طرف پاؤں بھی نہ پھیلائیں یا جیسے امام شافعی رحمہ اللہ اپنے استاذ امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے ورق بھی آہستہ پلٹاتے تھے۔یہ آداب اور اخلاق اپنانے کے لیے خود سے محنت کرنی پڑتی ہے۔اس کے لیے کسی خصوصی درس وغیرہ کی ضرورت نہیں۔

استاذ کے ساتھ ادب کا سبق آموز واقعہ:

استاذ اگر دھوپ میں جارہا ہو، تو خود دھوپ میں آکر استاذ کو سایہ کی طرف کرنا چاہیے۔اسی طرح جب استاذ

دھوپ میں کھڑا ہوتو شاگرد کے لیے استاذ کے سایہ کے اوپر کھڑا نہیں ہونا چاہیے؛ یہ بھی بے ادبی شمار ہوگی۔ اسی مناسبت سے میں (مصنف) اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ ہم اپنے اساتذہ کے ساتھ مدرسے کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مفتی محمد اسعد رحمہ اللہ، اور ان کے ساتھ میرے استاذ محترم حضرت عبداللہ سراج الدین اور مدرسہ شعبانیہ کے ایک اور استاذ تشریف فرما تھے۔ یہ بہار کا موسم تھا، صبح چاشت کے قریب کا وقت تھا، دھوپ ہلکی سی تھی، اس وقت میں دیکھتا ہوں کہ استاذ محترم حضرت عبداللہ دوسرے استاذ کو ہاتھ کی انگلی سے اشارہ فرمارہے ہیں کہ ہٹو؛ حضرت مفتی صاحب کے سایے سے دور ہوجاؤ؛ گویا یہ بھی بے ادبی شمار ہوگی۔

جانور بھی بزرگوں کا ادب کرتے ہیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جب چیونٹیوں کی وادی پر پہنچا تو:

قَالَتْ نَمْلَةٌ يَّاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَايَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَ جُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَايَشْعُرُوْن (سورۃ النمل:۱۸)

''ایک چیونٹی نے کہا: ''چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں پیس ڈالے، اور انہیں پتہ بھی نہ چلے۔''

اس میں دیکھیں کہ چیونٹی دوسری چیونٹیوں کو کہتی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر تمہیں روندے اور ان کو پتہ بھی نہ چلے۔ یعنی ابھی ہی سے ان کا عذر بیان کردیا کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکری اگر کہیں تمہیں روندیں گے بھی تو وہ معذور ہوں گے کیوں کہ وہ بڑے ہیں اور چھوٹی چیز کا ان کو پتا نہیں چلتا ہے۔ غلطی سرزد ہونے سے پہلے ہی عذر ان کی جانب سے بیان کرنا ادب کا تقاضا ہے۔ جب کہ ایک چھوٹی سی مخلوق حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحابہ کی اتنی عزت کرتے ہیں، اور اتنا ادب بجالاتے ہیں پھر ہم کیوں نہ اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ ادب سے پیش آئیں؟ اللہ تعالیٰ ہمیں صحابہ کرام کے ادب کی توفیق عنایت فرمائیں۔

طالب علم کا اپنے استاذ کے ساتھ ادب کا قرآنی واقعہ:

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کی جانب سفر کا واقعہ اور استاذ کے آداب کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے ملے، کہا:

قُلْ اَتَّبِعُکَ عَلٰی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْداً..... ''کیا میں آپ کے ساتھ اس غرض سے رہ سکتا ہوں کہ آپ کو بھلائی کا جو علم عطا ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ مجھے بھی سکھا دیں؟۔''

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب موسیٰ علیہ السلام علم حاصل کرنے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے، تو یہ آداب واخلاق بجالائے:

پہلا ادب:.....اپنے نفس کو استاذ کا تابع فرماں بنایا، اس طور پر کہ کہا: هَلْ اَتَّبِعُکَ؟

دوسرا ادب:.....اپنے نفس کو تابع بنانے میں استاذ سے اجازت لی، کہا: هَلْ اَتَّبِعُکَ؟ یہ حد درجہ عجز و انکساری ہے۔

تیسرا ادب:.....کہ آپ مجھے سکھائیں، یہ اپنی لاعلمی کا اظہار اور استاذ کی علمیت کا اقرار ہے۔

چوتھا ادب:.....انہوں نے کہا: مِمَّا عُلِّمْتَ..... یعنی جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے، یہاں کلمہ ''مِنْ'' تبعیض کے لیے ہے، جس کا مطلب ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو علم عطا فرمایا ہے اس میں سے کچھ حصہ مجھے سکھائیں! مکمل علم کا مطالبہ نہیں کر رہا کہ مساوات ہو، بلکہ کچھ علم دیجیے؛ جیسے ایک فقیر کسی غنی سے کچھ مانگتا ہے تو پورا مال نہیں مانگتا بلکہ کچھ مانگتا ہے۔

پانچواں ادب:.....اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے۔

چھٹا ادب:.....رشد و ہدایت کو طلب کیا، رشد و ہدایت اگر حاصل نہ ہو تو گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔

ساتواں ادب:.....اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ.....یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر احسان کر کے آپ کو علم عطا کیا اسی طرح آپ میرے اوپر احسان کرتے ہوئے علم عطا کیجیے! یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے کہ جو مجھے ایک لفظ سکھائے گا میں اس کا غلام ہوں۔

آٹھواں ادب:.....اخبار و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو علم تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے نبی ہیں، صاحبِ توراۃ ہیں۔ یہ وہی موسیٰ علیہ السلام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہم کلامی کا شرف بخشا ہے اور جن کو عظیم معجزات سے نوازا ہے۔ ان اعلیٰ مناصب اور بلند مقام و مرتبے کے باوجود اس عجز و انکساری کے ساتھ علم کے حصول کے لیے تشریف لائے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انتہائی تواضع، عجز و انکساری کے ساتھ علم حاصل کرنے آئے تھے۔

نواں ادب:.....اَتَّبِعُکَ.....یعنی میں تمام امور میں آپ کی تابعداری کروں گا، اتباع پہلے ہوگا علم بعد میں حاصل کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدمت کرنا پہلے درجے میں ہے علم حاصل کرنا بعد میں ہے۔

دسواں ادب:......هَلْ اَتَّبِعُکَ عَلٰی اَنْ تُعَلِّمَنِ......اس متابعت پر کوئی شرط نہیں لگائی کہ میں آپ کی اطاعت کروں گا اس ک ے بدلے مجھے جاہ و مال میں سے کچھ نہیں چاہیے، صرف علم حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔(التفسیر الکبیر تحت هذه الآیة و التحریر و التنویر :۱/۴۲)

طلبہ کے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے ادب کے عجیب واقعات:

امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ ''استاذ کا طالب علم پر رعب و دبدبہ'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ: مغیرہ ابن مقسم رحمہ اللہ نے کہا:

''ہم ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا ایسے احترام کرتے تھے جیسا امیر کا احترام کیا جاتا ہے۔''

ایوب سختیانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ایک آدمی نے حسن بصری رحمہ اللہ کے رعب و دبدبے کی وجہ سے تین سال میں ایک بات بھی نہ پوچھی۔''

عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''حضرت سعید ابن میبّب رحمہ اللہ کے سامنے ان کے رعب کی وجہ سے کوئی سوال کا جرأت نہیں کر سکتا تھا۔''

ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''میرا گھٹنا حضرت سعید ابن میبّب کے گھٹنے کے ساتھ ملا ہوا ہوتا، تب بھی کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔'' (الجامع :۲۹۷)

امام زرنوجی رحمہ اللہ استاذ کے ادب واحترام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''استاذ کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ ان کی اولاد اور ان کے متعلقین کے ساتھ آداب واحترام کا رویہ رکھا جائے، ہمارے استاذ یہ واقعہ سناتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے کبار اساتذہ میں سے ایک استاذ درس کے دوران کھڑے ہو جاتے۔ شاگرد پوچھتے کہ سبق کے دوراں کیوں کھڑے ہوتے ہو؟ کہا کہ گلی میں میرے استاذ کا بیٹا بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے، جب مسجد کے دروازے کے سامنے گزرتا ہے میں اپنے استاذ کی عظمت کی وجہ سے ان کے لیے بھی احتراماً کھڑا ہوتا ہوں۔'' (تعلیم المتعلم ،ص:۴۸)

اسحاق بن ابراہیم سے منقول ہے کہ: ''میں یحییٰ قطان کو کبھی دیکھتا کہ عصر کی نماز کے بعد وہ مسجد کے مینار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے، ابن مدینی، شاذکونی، عمر فلاس اور احمد بن معین وغیرہ ان کے سامنے سبق سننے کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان میں سے کوئی ان کی ہیبت اور دبدبے کی وجہ سے نہیں بیٹھ سکتا تھا، یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہو جاتی تھی، یہ تھک جاتے مگر استاذ کے ادب کی وجہ سے نہ بیٹھتے اور نہ ہی ان سے کہتے کہ بیٹھ جائیں۔

شاگرد کو اپنی مسند پر بیٹھانے کا تعجب انگیز واقعہ:

شریف عزیز الدین کہتے ہیں کہ: جب امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ ''مرو'' سے آئے، عظیم المرتبت اور انتہائی رعب و دبدبے کی وجہ سے کوئی ان سے بات تک نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی ان کے سامنے زور سے سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ ایک دن مجھے کہا کہ آپ ان طلبہ کے ناموں کی فہرست مرتب کرکے مجھے دیجیے؛ میں نے کہا سر بچشم۔ جب میں نے وہ کتاب مرتب کرکے ان کے سامنے پیش کی۔ وہ اپنی مسند سے اتر گئے اور مجھے کہا کہ آپ وہاں بیٹھ جائیں، خود چٹائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کی عظمت کی خاطر مسند پر بیٹھنے سے انکار کیا۔ چلاتے ہوئے خوب جھڑک کر کہا کہ بیٹھ جاؤ! پس میں مجبوراً بیٹھ گیا۔ وہ ان ناموں کا کتابچہ مجھے سنانے لگے، میں سنتا گیا یہاں تک کہ مکمل ہوگیا۔ پھر کہا کہ یہ بھی ایک علم ہے، میرے لیے مناسب نہیں کہ آپ پڑھائیں اور میں اوپر بیٹھا رہوں۔ یہ ادب واحترام کی عجیب مثال ہے، اور یاد رہے کہ شریف کی عمر امام رازی رحمہ اللہ کی وفات کے وقت ۳۴ سال تھی، اور امام رازی رحمہ اللہ ۶۲ سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ اب دیکھا جائے کہ اتنے کم عمر شاگرد کو اپنی مسند پر بٹھانا عجز کی انتہا ہے۔ (معجم الادباء: ۲/۶۵۴)

اپنے استاذ کے ساتھ رہتے ہوئے ان دنوں کو غنیمت سمجھو!

طالب علم کو چاہیے کہ استاذ کے ساتھ رہتے ہوئے ان ایام کو غنیمت سمجھے! ایک لمحہ ضائع نہ کرے، پھر ہاتھ ملتے ہوئے افسوس کرتے ہوئے ان دنوں کو یاد کرنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ جب موقع ہاتھ سے نکل جائے، پھر یہ کہنا کہ کاش میں استاذ محترم سے فلاں مسئلے کے بارے میں پوچھتا! کاش کہ میں بہت زیادہ استفادہ کرتا! کاش میں اس مغلق عبارت کو حل کرواتا! یہ کچھ فائدہ نہیں دے گا۔

امام اصمعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو طالب علم ایک لمحے کے لیے ذلت برداشت نہیں کرے گا اس کو زندگی بھر جہالت کی ذلت برداشت کرنا پڑے گی۔'' (المدخل الی السنن الکبریٰ، ص: ۴۰۳)

امام بیہقی تین عظیم اکابر: امام نخعی رحمہ اللہ، امام شعبی رحمہ اللہ، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''جو شخص علم سے شرمائے گا علم اس سے شرمائے گا۔'' (المدخل، ص: ۴۰۶)

امام سری سقطی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جس کو علم کی اہمیت معلوم ہوجائے وہ وقت یا مال دینے پر کوئی پروا نہیں کرتا۔'' (الجامع: ۷۸)

اس لیے ان ہی ایام کو غنیمت سمجھ کر اپنی تمام مشکلات اور مسائل حل کروانا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے تمام

اکابر اور سلفِ صالحین کی یہی حالت تھی کہ وہ اپنے اساتذہ سے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کے بارے میں پوچھتے تھے۔ ان کی رغبت اور شوق دیکھ دیکھ کر اساتذہ بھی مکمل وقت ان کو دیتے تھے۔

استاذ کے ساتھ انس ومحبت:

استفادہ اس وقت ممکن ہے جب استاذ کے ساتھ حد درجہ محبت ہو اور وہ استاذ کا ادب و احترام بجا لائے۔ استاذ اور شاگرد کے درمیان محبت اور اُنس کے بغیر کوئی استاذ طالب علم کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، اور نہ ہی شاگرد استفادہ کر سکتا ہے۔

اساتذہ بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ حد درجہ شفقت فرماتے تھے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں: امام وکیع بن الجراح رحمہ اللہ دوپہر کے وقت سخت گرمی میں شتر بانوں کے پاس جاتے اور انہیں حدیث پڑھاتے تھے اور فرماتے یہ ایسی قوم ہے جن کو علم کا شوق ضرور ہے مگر ان کی روزی کا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے میرے پاس نہیں آسکتے، میں خود ان کے پاس جا کر حدیث پڑھاؤں گا۔ سلف صالحین کے کئی ایسے واقعات ہیں جن سے ان کی محبت وشفقت آشکارا ہوتی ہے۔ (الجامع، ص:۳۶۳)

شاگرد کے ساتھ شفقت کا حیرت انگیز واقعہ:

ولید بن عتبہ دمشقی دمشق کے ایک بڑی مسجد میں پڑھاتے تھے، ایک شاگرد روز دیر سے آتا تھا۔ اکثر ان سے سبق کا کچھ حصہ گزر جاتا تھا، ولید دوبارہ ان کے لیے سبق دہراتے تھے۔ ایک مرتبہ ولید نے پوچھا کہ آپ کیوں روز دیر سے آتے ہو؟ کہا کہ میں صاحب عیال ہوں؛ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میں اپنی دکان کے لیے صبح سویرے بازار سے سامان لے کر آتا ہوں؛ کیونکہ بعد میں مجھے سامان نہیں ملتا ہے۔ استاذ نے کہا کہ آئندہ تمہیں یہاں نہ دیکھوں؛ پھر ہر روز استاذ محترم خود ان کی دکان پر جاتے اور وہیں پر ان کو پڑھاتے تھے۔ (احیاء العلوم:۱/۵۰)

اللہ تعالیٰ ان اکابرین اور سلف صالحین سے راضی ہو جائے، جنہوں نے اخلاق محمدیہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔

اپنے استاذ کی ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے:

استاذ محترم کی نصائح وہدایات پر عمل پیرا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شاگرد کو چاہیے کہ اپنی عملی لگام بالکلیہ طور پر استاذ کے ہاتھ میں تھمائے، ان کے نصائح پر ایسا ہی عمل کرے جیسا کہ مریض کسی طبیبِ حاذق اور مشفق حکیم کی باتوں پر عمل کرتا ہے۔ اپنے استاذ کے سامنے مکمل عاجزی اختیار کرے، استاذ کی خدمت ہی کو اپنے لیے باعث شرف وثواب سمجھے، علم بغیر عجز اور سمع وطاعت کے حاصل نہیں ہوتا۔ طالب علم

اپنے آپ کو اس نرم اور ہموار زمین کی مانند بنائے جس پر موسلا دھار بارش برس کر مکمل طور پر سیراب ہوئی ہو اور زراعت کے لیے بالکل تیار ہو۔ جب بھی استاذ کسی چیز کا مشورہ دے طالب علم کو چاہیے کہ اس کی اطاعت کرے اور اپنی رائے سے مکمل دست بردار ہو، اس لیے کہ مرشد کی غلطی بھی اس کی صحیح رائے سے زیادہ مفید ہے۔'' (احیاء العلوم: ۱/۵۰)

ایک اور جگہ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''طالب علم کو چاہیے کہ اپنے استاذ اور شیخ کے سامنے ایسا بیٹھا رہے گویا کہ اس کو تمام عیوب اور راز کی باتوں کا علم ہو، اپنے آپ کو ملامت سمجھے، استاذ کے اشاروں اور ارشادات پر عمل کرے۔ یہی کیفیت مرید کی اپنے شیخ کے ساتھ بھی ہونی چاہیے۔'' (احیاء العلوم: ۳/۶۴)

امام ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''طالب علم کو اخلاق و آداب میں اپنے استاذ کا ثانی ہونا چاہیے، تمام افعال، اعمال و عادات میں اس کی مشابہت اختیار کرے، تاکہ محبت اور الفت میں اضافہ ہو جائے۔'' اس حدیث کے مصداق بننے کی کوشش کرے۔ ''**من تشبه بقوم فهو منهم**'' جو شخص جس قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے وہ (روز محشر) اسی کے ساتھ ہوگا۔ (۱: ادب الدنیا والدین ص: ۱۱۳)

علم کے آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جب تم علم حاصل کرو تو اس کو خوب از بر یاد کرو! ہنسی مذاق میں اس کو خلط ملط نہ کرو!'' (الجامع للخطیب: ص: ۲۱۳)

ہشام دستوائی رضی اللہ عنہ کی مجلسِ حدیث میں کوئی ہنسا اس سے فرمایا: ''کیا آپ حدیث کا علم حاصل کرتے ہوئے ہنستے ہو؟''

حضرت سفیان رحمہ اللہ نے ایک طالب علم کو مزاح کرتے ہوئے ہنستے ہوئے دیکھا۔ فرمایا:

''آپ اس مقام و مرتبے میں ہنس رہے ہو! ہونا تو چاہیے کہ کوئی ایک حدیث مبارک سن لیں، تو تین دن تک وہ وقار اور ادب کے ساتھ رہے۔''

عبداللہ بن مبارک عبدالاعلی تمیمی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں: ''کہ جو علم حاصل کرے اور پھر وہ نہ روئے وہ اس لائق نہیں کہ علم اس کو نفع پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ نے علماء کی صفات کچھ یوں بیان فرمائی ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّداً (سورۃ الاسراء:۱۰۷)

جب (یہ قرآن) ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا تھا تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں، اور کہتے ہیں: ''پاک ہے ہمارا پروردگار! بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہی ہوکر رہتا ہے۔'' اور روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں اور یہ قرآن ان کے دلوں کی عاجزی اور بڑھا دیتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سامنے رونا علماء اور طلبہ کی اہم صفات میں سے ہے، رو رو کر اللہ سے اپنی کامیابی اور اپنے اساتذہ اور والدین اور پوری امت کو (خاص کر اس عاصی گناہ گار مترجم کو) اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد کیا کریں۔

اپنے علم پر فوری طور پر عمل کرنا چاہیے:

''جو علم حاصل کرتا ہے، اس کی باتوں میں اس کا اثر ظاہر ہونا چاہیے، اس کے قول وفعل، اس کے طریقہ وروش پر یہ علم اثر انداز ہونا چاہیے، اس کے اندر وعجز وانکساری آنی چاہیے۔'' (الزھد، ص:۱۲۵، وفضائل القرآن، ص:۶۶)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ امام ابراہیم حربی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''جس شخص کو آدابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جس ادب کے بارے میں علم ہو جائے، اس کو چاہیے کہ اس ادب کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔'' (الجامع:۱۷۶)

اسی طرح وہ ابوعیصمہ بیہقی سے نقل کرتے ہیں: فرمایا ''میں نے ایک رات امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ہاں گزاری، امام صاحب نے وضو کا پانی لاکر رکھ دیا، جب صبح وہ آئے پانی وہیں کے وہیں رکھا تھا، امام صاحب نے متعجب ہوکر فرمایا: سبحان اللہ! کوئی علم حاصل کرے اور صلوٰۃ اللیل سے محروم رہے۔ (یعنی یہ کیسے ہوسکتا ہے؟)

عظیم داعی محمد عوض حضرت شیخ عبدالکبیر رفاعی رحمہ اللہ کے بڑے تلامذہ میں سے ہیں۔ وہ مسجد میں چاشت کی نماز پڑھ کر سلام کے بعد فوراً کھڑے ہوئے، پیچھے سے ان کے استاذ محترم شیخ عبدالکبیر رفاعی رحمہ اللہ دیکھ رہے تھے، استاذ نے ان کو کہا کہ ''اے شیخ محمد گویا آپ اپنے رب سے مستغنی ہوگئے ہیں!؟ شاگرد نے مشتاق ہوکر پوچھا کہا، کیوں خیر ہے؟ کہا کہ آپ نماز پڑھ کر فوراً کھڑے ہوئے اور کچھ دعا نہیں مانگی۔'' پہلے اس طرح اساتذہ اپنے تلامذہ کی راہنمائی کرتے تھے، وہ کمالات کے اعلیٰ مقام حاصل کرتے تھے۔ جن کا اپنے اساتذہ کے ساتھ کوئی ربط وتعلق نہ ہو وہ کہاں علم حاصل کرسکتا ہے؟ جو استاذ کی تربیت میں آئے بغیر صرف اسناد حاصل کرتے ہیں، وہ ترقی وکمالات کے بوتک نہیں سونگھ سکتے ہیں۔

کتابوں کے آداب:

طالب علم کو ہر وقت باوضو ہو کر رہنا چاہیے خواہ وہ مطالعہ کر رہا ہو، سبق پڑھ رہا ہو یا تکرار کر رہا ہو۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ امام ابوعثمان صابونی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ ''میں کبھی کسی لائبریری یا کتب خانے میں بغیر وضو کے داخل نہیں ہوا۔ کبھی میں نے بغیر وضو کے حدیث روایت نہیں کی اور کبھی میں درس و تدریس کے لیے بے وضو ہو کر نہیں بیٹھا۔'' (تاریخ ابن عساکر: ۹/۹)

امام زرنوجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کتاب کی تعظیم بھی علم کی تعظیم ہے، پس طالب علم کتاب بغیر وضو کے نہ چھوئے۔'' (تعلیم المتعلم ص: ۵۱)

امام شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے علم کو عظمت کے ساتھ حاصل کیا، کاغذ کو بھی بغیر وضو کے ہاتھ نہیں لگایا۔''

امام شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ پیٹ کے بیماری میں مبتلا تھے، وہ رات کو بار بار وضو بناتے جاتے، ایک رات کو سترہ مرتبہ وضو کر کے آئے، یہ اس لیے کہ علم نور ہے اور وضو بھی نور ہے، وضو سے علم کا نور بڑھتا ہے۔ (علم کی نورانیت کی وجہ سے وہ کتاب کو بغیر وضو کے ہاتھ نہیں لگاتے اگرچہ سترہ مرتبہ وضو کرنا پڑا۔)

کتابوں کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ کتاب کی طرف پاؤں نہ پھیلائیں، اسی طرح تفسیر کی کتابوں کو تمام کتابوں سے اوپر رکھیں، پھر حدیث کی، پھر فقہ کی، اس طرح ترتیب وار رکھیں، کتاب پر کوئی چیز نہ رکھیں، یہاں تک کہ قلم اور دوات بھی کتابوں کے اوپر نہ رکھیں۔

بے ادبی کا عبرت ناک واقعہ:

اس سے مجھے (مصنفِ کتاب شیخ محمد عوامۃ) اپنے طالب علمی کا واقعہ یاد آیا، اس واقعے کا ابتدائی حصہ مجھے بہت پسند ہے اور آخری حصے سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے، ان صفحات میں اس واقعے کو قلم بند کرنا دل پر بہت گراں گزرتا ہے، مگر صرف طلبہ کرام کو اس جیسے امور سے بچنے اور محتاط رہنے کی خاطر حوالہ قرطاس کرتا ہوں۔

میں حلب میں واقع مدرسہ شعبانیہ میں پڑھتا تھا، ایک مرتبہ ایک کتاب بائیں ہاتھ میں لے کر جا رہا تھا کہ میرے استاذ شیخ احمد قلاش نور اللہ مرقدہ نے مجھے دیکھا، کتاب مجھ سے لے کر دائیں ہاتھ میں تھما دی اور اس طرح دعا فرمائی: ''**اللھم آتنی کتابی بیمینی**۔'' اے اللہ! مجھے میرا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں عطا فرما۔'' آمین۔

کچھ دنوں کے بعد جامعہ دمشق میں کلیۃ شرعیۃ کا امتحان دینے گیا، امام سمرقندی رحمہ اللہ کی کتاب ''تحفۃ الفقہاء''

کا زبانی امتحان تھا۔ایک طالب علم بہت دیر تک کھڑا انتظار کررہا تھا،تھک کر بیٹھنے لگے، دیکھا زمین غبار آلود تھی انہوں نے سیاہ کپڑے زیب تن کیے تھے، جس پر مٹی کا اثر جلد نظر آتا ہے۔ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہیں آیا، کتاب ''تحفۃ الفقہاء'' کو زمین پر رکھ کر اس پر بیٹھ گئے۔(العیاذ باللہ)۔واللہ یہ واقعہ لکھتے ہوئے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔اس واقعے سے مقصود صرف یہ ہے کہ اچھی تربیت اور بری تربیت کا بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔وہاں مجھے صرف بائیں ہاتھ میں کتاب اٹھانے نہیں دیا جارہا تھا، کیوں کہ استاذ اور مربی ایسے تھے جن کو علم کی قدر تھی اور یہ شخص اچھی تربیت سے محروم تھا اس لیے انہوں نے کتاب کی اتنی بے ادبی کی۔اگر کوئی اس طرح تربیت سے محروم گونگا بہرا ہوگا، وہ کہاں علم کا نور حاصل کر پائے گا؟

حسن خلق کامیابی کی ضمانت ہے:

کامیابی بغیر ادب کے نہیں ملتی، اور اگر کوئی ناکام ہوا ہے تو بے ادبی کے بغیر ناکام نہیں ہوا۔امام زرنوجی رحمہ اللہ سے اس جیسا مضمون مروی ہے:.....''جو بھی کامیاب ہوا ہے دوسروں کے احترام کی بدولت کامیاب ہوا ہے اور کوئی بداخلاقی کیے بغیر ناکام نہیں ہوا ہے۔''(تعلیم المتعلم:۴۶)

یہاں دو جملے ہیں: ایک یہ کہ کوئی بے ادبی کے بغیر نامراد نہیں ہوا ہے، اس کی مثال ابلیس لعین کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا، تو اس نے بے ادبی کرتے ہوئے حکم خداوندی سے انکار کیا ہمیشہ کے لیے ناکام ہوا۔

دوسرا جملہ ہے کہ کوئی دوسروں کی عزت اور ادب کیے بغیر کامیاب نہیں ہوا، اس کی مثال حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وہ مشہور قصہ ہے جو بخاری میں بھی منقول ہے:

عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم دخل الخلاء، فوضعت له وضوءً قال: من وضع هذا؟ فأخبر فقال: اللهم فقهه فی الدین (صحیح البخاری)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء تشریف لے گئے، میں نے ان کے لیے وضو کا پانی رکھ دیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، پانی دیکھ کر پوچھا کہ ''یہ وضو کا پانی کس نے رکھا ہے؟''

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رکھا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے سینے سے لگایا اور ان کے لیے دعا فرمائی: **اللّٰھم فقھه فی الدین** ''یا اللہ! ان کو دین کی سمجھ عطا فرما۔'' ایک روایت میں ہے کہ ''اے اللہ! ان کو حکمت و دانائی نصیب فرما۔'' ایک اور روایت میں اس طرح منقول ہے ''اے اللہ!

ان کو قرآن کا علم عطا فرما۔'' اور ایک روایت میں اس طرح بھی آیا ہے کہ ''اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا فرما۔''

خدمت اور ادب کی وجہ سے دعائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہونا:

ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ سے مروی ہے:

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں ایک مرتبہ آخر شب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز کی نیت باندھی، میرا ہاتھ پکڑ کر کے مجھے اپنے برابر میں کھڑا کیا، جب وہ نماز میں مشغول ہوئے، میں پیچھے ہٹ گیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے فرمایا کہ ''میں نے کہا کہ کیا کسی کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑا ہو جائے؟ میری یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آئی اور مجھے علم وفہم میں زیادتی کی دعا دی۔'' (رواہ ابن ابی شیبہ)

ان میں سے پہلے واقعے میں خدمت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی اور دوسرے واقعے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ نبوت کے ادب واحترام بجالانے کی وجہ سے دعا دی۔ اس دعا کی برکت سے وہ کبار صحابہ کے درجے کو پہنچ گیا، یہاں تک کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اگر ابن عباس ہمارے زمانے کو پاتے تو ہم میں سے کوئی اس کے علم کے دسویں حصے تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔'' (رواہ ابن ابی شیبہ)

اسی طرح انہوں نے فرمایا: ''ابن عباس بہترین ترجمان قرآن ہیں۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے لوگوں میں سب سے زیادہ اس کا علم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ہے۔'' (تاریخ ابوزرعۃ دمشقی: ۱۷۵۸)

ان کو ''خیر امت'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

کسی نے ان کے رحلت کے دن فرمایا: ''آج ربانی علم وفات پا گئے۔''

☆☆☆

اولاد کی ظاہری وباطنی تربیت

اہمیت.....اور.....انداز

مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی

بچے مستقبل میں قوم کے معمار ہوتے ہیں، اگر اُنھیں صحیح تربیت دی جائے تو اس کا مطلب ہے ایک اچھے اور مضبوط معاشرے کے لیے ایک صحیح بنیاد ڈال دی گئی۔ بچوں کی اچھی تربیت سے ایک مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے؛ اس لیے کہ ایک اچھا پودا ہی مستقبل میں تناور درخت بن سکتا ہے۔

بچپن کی تربیت نقش علی الحجر ہوتی ہے، بچپن میں ہی اگر بچے کی صحیح دینی واخلاقی تربیت اور اصلاح کی جائے تو بڑے ہونے کے بعد بھی وہ ان پر عمل پیرا رہے گا۔ اس کے برخلاف اگر درست طریقہ سے ان کی تربیت نہ کی گئی تو بلوغت کے بعد ان سے بھلائی کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی، نیز بلوغت کے بعد وہ جن برے اخلاق واعمال کا مرتکب ہوگا، اس کے ذمہ دار اور قصوروار والدین ہی ہوں گے، جنہوں نے ابتدا سے ہی ان کی صحیح رہنمائی نہیں کی۔ نیز! اولاد کی اچھی اور دینی تربیت دنیا میں والدین کے لیے نیک نامی کا باعث اور آخرت میں کامیابی کا سبب ہے؛ جب کہ نافرمان وبے تربیت اولاد دنیا میں بھی والدین کے لیے وبالِ جان ہوگی اور آخرت میں بھی رسوائی کا سبب بنے گی۔

لفظِ ''تربیت'' ایک وسیع مفہوم رکھنے والا لفظ ہے، اس لفظ کے تحت افراد کی تربیت، خاندان کی تربیت، معاشرہ اور سوسائٹی کی تربیت، پھر ان قسموں میں بہت سی ذیلی اقسام داخل ہیں۔ ان سب اقسام کی تربیت کا اصل مقصد وغرض، عمدہ، پاکیزہ، بااخلاق اور باکردار معاشرہ کا قیام ہے۔ تربیتِ اولاد بھی اُنھیں اقسام میں سے ایک اہم قسم ہے۔

آسان الفاظ میں ''تربیت'' کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ: ''برے اخلاق وعادات اور غلط ماحول کو اچھے اخلاق وعادات اور ایک صالح، پاکیزہ ماحول سے تبدیل کرنے کا نام ''تربیت'' ہے۔''

تربیت کی دو قسمیں:

تربیت دو قسم کی ہوتی ہے: (۱) ظاہری تربیت، (۲) باطنی تربیت۔

ظاہری اعتبار سے تربیت میں اولاد کی ظاہری وضع قطع، لباس، کھانے، پینے، نشست وبرخاست، میل جول، اس کے دوست واحباب اور تعلقات ومشاغل کو نظر میں رکھنا، اس کے تعلیمی کوائف کی جانکاری اور بلوغت کے بعد ان

کے ذرائع معاش کی نگرانی وغیرہ امور شامل ہیں، یہ تمام امور اولاد کی ظاہری تربیت میں داخل ہیں، اور باطنی تربیت سے مراد اُن کے عقیدہ اور اخلاق کی اصلاح ودرستی ہے۔

اولاد کی ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی تربیت والدین کے ذمہ فرض ہے۔ ماں باپ کے دل میں اپنی اولاد کے لیے بے حد رحمت وشفقت کا فطری جذبہ اور احساس پایا جاتا ہے۔ یہی پدری ومادری فطری جذبات واحساسات ہی ہیں جو بچوں کی دیکھ بھال، تربیت اور اُن کی ضروریات کی کفالت پر اُنھیں اُبھارتے ہیں۔ ماں باپ کے دل میں یہ جذبات راسخ ہوں اور ساتھ ساتھ اپنی دینی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہو تو وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں احسن طریقہ سے اخلاص کے ساتھ پوری کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں اولاد کی تربیت کے متعلق واضح ارشادات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ''۔ (التحریم:٦)

ترجمہ: ''اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر وتشریح میں فرمایا کہ: ''عَلِّمُوْهُمْ وَأَدِّبُوْهُم''۔

ترجمہ: ''ان (اپنی ولاد) کو تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ''۔

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو فرائض شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کے لیے کوشش کرے۔

اولاد کی تربیت کی اہمیت کا اندازہ ان احادیث سے بھی ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

١-''مَانَحَلَ والدٌ أفضلَ مِنْ أدبٍ حسنٍ''۔ (بخاری)

ترجمہ: ''کوئی باپ اپنی اولاد کو اس سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا کہ اس کو اچھے آداب سکھا دے''۔

یعنی اچھی تربیت کرنا اور اچھے آداب سکھانا اولاد کے لیے سب سے بہترین عطیہ ہے۔

٢-''عن ابن عباس .....قالوا: یارسول اللّٰہ! قد علمنا ما حق الوالد فماحق الولد؟ قال: أن یحسن اسمه ویحسن أدبه''۔ (سنن بیہقی) ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! والدین کے حقوق تو ہم نے جان لیے، اولاد کے کیا حقوق ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ یہ ہے کہ اس کا نام اچھا رکھے اور اس کی اچھی تربیت کرے''۔

٣-''یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ انسان جن کا ذمہ دار ورکھوالا ہے، اُنھیں ضائع کر دے، ان کی تربیت نہ کرے''۔

یہ بھی ضائع کرنا ہے کہ بچوں کو یونہی چھوڑ دینا کہ وہ بھٹکتے پھریں، صحیح راستہ سے ہٹ جائیں، ان کے عقائد

واخلاق برباد ہوجائیں۔ نیز اسلام کی نظر میں ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے، بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں جن امور کا جاننا ضروری ہے، اُس میں کوتاہی کرنا قیامت کی باز پرس سے نہیں بچاسکتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ارشاد ہے:

''اپنی اولاد کو ادب سکھلاؤ، قیامت والے دن تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ تم نے اسے کیا ادب سکھلایا؟ اور کس علم کی تعلیم دی؟۔'' (شعب الإیمان للبیہقی)

بچوں کی حوصلہ افزائی:

بچہ نرم گیلی مٹی کی طرح ہوتا ہے، ہم اس سے جس طرح پیش آئیں گے، اس کی شکل ویسی ہی بن جائے گی۔ بچہ اگر کوئی اچھا کام کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کی تعریف سے دریغ نہیں کرنا چاہیے اور اس پر اُسے شاباش اور کوئی ایسا تحفہ وغیرہ دینا چاہیے جس سے بچہ خوش ہوجائے اور آئندہ بھی اچھے کام کا جذبہ اور شوق اس کے دل میں پیدا ہوجائے۔

بچوں کی غلطی پر تنبیہ کا حکیمانہ انداز:

بچوں کو کسی غلط کام پر بار بار اور مسلسل ٹوکنا اُن کی طبیعت میں غلط چیز راسخ ہونے سے حفاظت کا سبب بنتا ہے، جس سے اگر غفلت نہ برتی گئی تو اس میں شک نہیں کہ بچوں اور بچیوں میں غلط افکار جڑ پکڑنے سے پہلے کامل طریقہ سے ان کی بیخ کنی ہوگی۔ بچے سے خطا ہوجانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے، غلطی تو بڑوں سے بھی ہوجاتی ہے۔ ماحول کا بچوں پر اثر ہوتا ہے، ممکن ہے کہ غلط ماحول کی وجہ سے بچہ کوئی غلطی کر بیٹھے، تو اس صورت حال کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ بچے سے غلطی کس سبب سے ہوئی؟ اسی اعتبار سے اسے سمجھایا جائے۔ تربیت میں میانہ روی اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، مربی کو اس بات سے باخبر ہونا چاہیے کہ اس وقت بچہ کے لیے نصیحت کارگر ہے یا سزا؟ تو جہاں جس قدر سختی اور نرمی کی ضرورت ہو اسی قدر کی جائے۔ بہت زیادہ سختی اور بہت زیادہ نرمی بھی بعض اوقات بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔

تربیت میں تدریجی انداز اختیار کرنا چاہیے؛ چنانچہ غلطی پر تنبیہ کی ترتیب یوں ہونی چاہیے: ۱- سمجھانا۔ ۲- ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔ ۳- مار کے علاوہ کوئی سزا دینا۔ ۴- مارنا۔ ۵- قطع تعلق کرنا۔ یعنی غلطی ہوجانے پر بچوں کی تربیت حکمت کے ساتھ کی جائے، اگر پہلی مرتبہ غلطی ہو تو اولاً اُسے اشاروں اور کنایوں سے سمجھایا جائے، صراحۃً برائی کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ اگر بچہ بار بار ایک ہی غلطی کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ بات بٹھائیں کہ اگر دوبارہ ایسا کیا تو اس کے ساتھ سختی برتی جائے گی، اس وقت بھی ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت نہیں ہے، نصیحت اور پیار سے اُسے غلطی کا احساس

دلایا جائے۔

پیار ومحبت سے بچوں کی تربیت واصلاح کا ایک واقعہ حضرت عمر بن ابی سلمہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ میں بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تربیت اور زیر کفالت تھا، میرا ہاتھ کھانے کے برتن میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''**یا غلامُ سَمِّ اللّٰہ! وکل بیمینک وکل ممایلیک**''.... ''اے لڑکے! اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کرو اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنی طرف سے کھاؤ۔''

اگر نصیحت اور آرام سے سمجھانے کے بعد بھی بچہ غلطی کرے تو اُسے تنہائی میں ڈانٹا جائے اور اس کام کی برائی بتائی جائے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کو کہا جائے۔ پھر بھی اگر باز نہ آئے تو تھوڑی پٹائی بھی کی جاسکتی ہے۔ تربیت کے یہ طریقے نوعمر بچوں کے لیے ہیں؛ لیکن بلوغت کے بعد تربیت کے طریقے مختلف ہیں، اگر اس وقت نصیحت سے نہ سمجھے تو جب تک وہ اپنی برائی سے باز نہ آئے اس سے قطع تعلق بھی کیا جاسکتا ہے، جو شرعاً درست ہے اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مغفل کے ایک رشتہ دار تھے جو ابھی بالغ نہ ہوئے تھے، انھوں نے کنکر پھینکا تو حضرت عبداللہ نے منع کیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکر مارنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ: ''اِنّھا لاتصید صیدًا'' اس سے کوئی جانور شکار نہیں ہوسکتا، اس نے پھر کنکر پھینکا تو انھوں نے غصہ سے فرمایا کہ میں تمہیں بتلا رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور تم پھر دوبارہ ایسا ہی کر رہے ہو؟ میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر نے بھی اپنے بیٹے سے ایک موقع سے قطع تعلق کیا تھا اور مرتے دم تک اس سے بات نہ کی۔

بچوں کو ڈانٹنے اور مارنے کی حدود:

بچوں کی تربیت کے لیے ماں باپ یا استاد کا اُنھیں تھوڑا بہت، ہلکا پھلکا مارنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بلکہ بعض اوقات ضروری ہوجاتا ہے۔ اس معاملہ میں افراط وتفریط کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ غصہ میں بے قابو ہوجانا اور حد سے زیادہ مارنا یا بچوں کے مارنے ہی کو غلط سمجھنا دونوں باتیں غلط ہیں۔ پہلی صورت میں افراط ہے اور دوسری میں تفریط ہے۔ اعتدال کا راستہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو؛ جب کہ وہ سات سال کے ہوجائیں اور ان کو نماز نہ پڑھنے پر مارو؛ جب کہ وہ دس سال کے ہوجائیں''۔ (مشکوٰۃ) اس حدیث سے مناسب موقع پر حسبِ ضرورت مارنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

مارنے میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس حد تک نہ مارا جائے کہ جسم پر مار کا نشان پڑجائے۔ نیز جس

وقت غصہ آرہا ہو، اس وقت بھی نہ مارا جائے؛ بلکہ بعد میں جب غصہ ٹھنڈا ہوجائے تو اس وقت مصنوعی غصہ ظاہر کرکے مارا جائے؛ کیونکہ طبعی غصہ کے وقت مارنے میں حد سے تجاوز کرجانے کا خطرہ ہوتا ہے اور مصنوعی غصہ میں یہ خطرہ نہیں ہوتا، مقصد بھی حاصل ہوجاتا ہے اور تجاوز بھی نہیں ہوتا۔

لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینا گناہ ہے:

اولاد اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمت اور تحفہ ہے، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے بچوں پر رحم وشفقت کے معاملہ میں مذکر ومؤنث میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ جو والدین لڑکے کی بہ نسبت لڑکی سے امتیازی سلوک کرتے ہیں، وہ جاہلیت کی پرانی برائی میں مبتلا ہیں، اس طرح کی سوچ اور عمل کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ بلکہ دینی اعتبار سے تو اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ لڑکی کو کمتر سمجھنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے سے ناخوشی کا اظہار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُسے لڑکی دے کر کیا ہے، ایسے آدمی کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تو کیا پوری دنیا بھی مل کر اللہ تعالیٰ کے اس اٹل فیصلہ کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ یہ درحقیقت زمانہ جاہلیت کی فرسودہ اور قبیح سوچ ہے، جس کو ختم کرنے کے لیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین اور تربیت کرنے والوں کو لڑکیوں کے ساتھ اچھے برتاؤ اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنے کی بار بار نصیحت کی۔

اولاد کے درمیان برابری اور عدل:

ابوداؤد شریف میں حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث ہے: ''**قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اعدلوا بین أبنائکم اعدلوا بین أبنائکم اعدلوا بین أبنائکم**''۔ (ابوداؤد، جلد:۲، ص:۴۴۱)

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو، اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو، اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو''۔

مطلب یہ ہے کہ ظاہری تقسیم کے اعتبار سے سب بچوں میں برابری کرنی چاہیے؛ کیونکہ اگر برابری نہ ہو تو بچوں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ ہاں! فطری طور پر کسی بچے سے دلی طور پر زیادہ محبت ہو تو اس پر کوئی پکڑ نہیں؛ بشرطیکہ ظاہری طور پر برابری رکھے۔ حدیث میں تین بار مکرر برابری کی تاکید آئی ہے جو اس کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے، یعنی اولاد کے درمیان برابری کرنا واجب ہے، اور برابری نہ کرنا ظلم شمار ہوگا۔ اور اس کا خیال نہ رکھنا اولاد میں احساسِ کمتری اور باغیانہ سوچ کو جنم دیتا ہے، جس کے بعد بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمان والدین کو اپنی اولاد سے متعلق ذمہ داریاں احسن طریقہ سے نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!۔

صالح اولاد کے لیے دعاؤں کا اہتمام

محمد احمد حافظ

اولاد اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، ہر انسان کے اندر اللہ رب العزت نے ایک فطری خواہش رکھی ہے کہ جب وہ جوانی کی عمر کو پہنچے تو اس کی شادی ہو، شادی کے بعد وہ صاحب اولاد ہو جائے۔ اولاد کا ہونا ایک خوشی ہوتی ہے اور اولاد کا نیک ہونا دوگنی خوشی ہوتی ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

أيُّ شيءٍ أقر لعين المؤمن من أنْ يرى زوجته وولده يطيعون اللّٰه ذكره.

''بھلا مومن کے لیے اس سے بڑھ کر آنکھوں کی ٹھنڈک کس چیز میں ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے بیوی، بچوں کو اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرمان بردار دیکھے۔'' (النفقۃ علی العیال لابن ابی الدنیا)

اگر انسان کی اولاد نیک ہو تو اللہ تعالیٰ جنت میں بھی اس کی اولاد کو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے سکون کا باعث بنائیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ. (الطّور:۲۱)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ ان کے راستے پر چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔''

اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

إنَّ اللّٰهَ تبارَكَ وتعالى يَرْفَعُ لِلْمُؤْمِنِ ذُرِّيَّتَهُ، وإنْ كانُوا دُونَهُ فِي العَمَلِ، لِيُقِرَّ اللّٰهُ بِهِمْ عَيْنَهُ.

''اللہ تعالیٰ مومن کے لیے اس کی اولاد کے درجات بھی اس کے ساتھ بلند کر دیتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی اولاد کے ذریعے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈا کریں، چاہے ان کے اعمال اس سے کچھ کم ہی ہوں۔'' (تفسیر طبری)

جب بھی اللہ رب العزت سے اولاد کی دعا مانگیں تو ہمیشہ نیک اولاد کی دعا مانگیں۔ بچوں کا نیک ہونا' ماں باپ کا اپنی اولاد کی تربیت کرنا یہ اللہ رب العزت کو بہت پسند ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحتیں کیں۔ اللہ رب العزت کو یہ نصیحتیں اتنی اچھی لگیں کہ ان کو قرآن مجید میں نقل فرمایا اور سورۃ کا نام بھی لقمان رکھ دیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی زندگیوں میں اپنی اولادوں کیلئے دعائیں مانگی ہیں، اگر ان کی دعاؤں کے الفاظ دیکھے جائیں تو فقط انہوں نے اولاد نہیں مانگی بلکہ نیک اولاد مانگی۔

عموماً ہم اپنی اولاد کی اچھی تربیت کے حوالے سے مادی اور حسی ذرائع استعمال کرتے ہیں، بہترین تعلیم کے لیے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا انتخاب کرتے ہیں، تربیت میں بھی اپنے تئیں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، لیکن ایک چیز پر توجہ کم دیتے ہیں اور وہ ہے اولاد کے لیے کثرت سے دعا کرنا، اپنی اولاد کی اچھی تعلیم اور بہترین تربیت کرنے کے ساتھ ان کے لیے دعا کرنا کبھی نہ بھولیے۔ ہمارے وہ احباب جو کسی دینی کام سے وابستہ ہیں، خواہ وہ مدرس ہیں، خطیب ہیں، مقتدر دینی رہنما ہیں، یا مدرسہ کے مہتمم ہیں؛ انہیں اپنی اولاد اور اہل وعیال کی نیکوکاری، صالحیت، صلاحیت، حفاظت و صیانت اور ان کی دنیوی واخروی کامیابی کے لیے بہت زیادہ دعا کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ دینی کام کرنے والوں کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہمیشہ ان کے درپئے آزار رہتا ہے، اوّلاً تو ان کی ذات کو نشانے پر رکھتا ہے کہ شیطان انہیں کسی طرح دینی کام سے بہکا دے، اس میں کامیاب نہیں ہوتا تو بیوی بچوں کو ورغلاتا ہے، انہیں نافرمان، کند ذہن، آوارہ اور بدطینت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں اولاد ان کے لیے ایک کڑی آزمائش بن جاتی ہے۔ اس لیے دینی خدام کو اپنی دعاؤں میں اولاد کے لیے ضرور حصہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنی اولاد کے لیے دعائیں مانگی ہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعائیں:

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاؤں کا تو اللہ تعالیٰ نے عجیب نقشہ کھینچا ہے، آپ علیہ السلام بوڑھے ہوگئے، مگر اولاد کی نعمت نصیب نہیں ہوئی، اللہ رب العزت سے دعائیں کرتے ہیں مایوس نہیں ہوئے۔ اگرچہ ظاہری بدن میں بڑھاپے کے آثار ظاہر ہوگئے۔ ہڈیاں گھلنے لگیں، سارے بال سفید ہوکر چمکنے لگے۔ اس عمر میں تو انسان کی ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ناامیدی دل میں آنے لگ جاتی ہیں مگر وہ تو اللہ رب العزت کے پیغمبر تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ یہ سب کچھ اللہ رب العزت کے حکم سے ہوتا ہے۔ چنانچہ بڑھاپے میں بھی دعا مانگتے۔ قرآن مجید نے ان کے اندازِ دُعا کو نقل کیا ہے:

كٓهٰيٰعٓصٓ. ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا. اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَاءً خَفِيًّا (مریم:۱،۲،۳)

''یہ ذکر ہے تیرے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر کی، جب پکارا انہوں نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارنا۔

اب سوچئے کہ جب دل میں تمنا ہوتی ہے تو بے اختیار انسان کے دل سے دعائیں نکل رہی ہوتی ہیں۔ انسان کبھی تنہائیوں میں جاکر دعائیں مانگتا ہے۔ کبھی اونچی آواز میں مانگتا ہے کبھی چپکے چپکے مانگتا ہے، مگر حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کیا مانگی؟.....عرض کیا: رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ (سورۃ مریم:۴) ''اے میرے اللہ! اب

میری ہڈیاں گھلنے کا وقت آ گیا'' وَاشْتَعَلَ الرَّاسُ شَيْبًا'' میرے بال سفید ہو کر چمکنے لگ گئے۔'' وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (سورۃ مریم) ''لیکن اے اللہ میں آپ سے جو دعائیں مانگتا ہوں، اس بارے میں ناامید نہیں ہوں۔''

اب دعا مانگتے مانگتے جس پر بڑھاپا آجائے اور پھر بھی وہ اتنی لجاجت سے اور اس قدر عاجزی اور نیازمندی سے دعائیں مانگ رہا ہو تو پروردگار کی رحمت کو ضرور جوش آئے گا.....ان کی دعا کیا تھی؟

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَرَاءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِیْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا (سورۃ مریم آیت:۵،۶)

ترجمہ: اور مجھے اپنے بعد اپنے چچازاد بھائیوں کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔ اور میری بیوی بانجھ ہے، لہذا آپ خاص اپنے پاس سے مجھے ایک ایسا وارث عطا کر دیجیے۔ جو میرا بھی وارث ہو، اور یعقوبؑ کی اولاد سے بھی میراث پائے۔ اور یارب! اسے ایسا بنایے جو (خود آپ کا) پسندیدہ ہو۔

کتنی پیاری دعا مانگی؟!.....بیٹا بھی مانگا تو ایسا کہ جو اپنے باپ دادا کے کمالات کا اور اپنے باپ دادا کے علوم کا وارث بنے۔ تو یہی اصل مقصود ہوتا ہے کہ اولاد ہو اور نیک ہو، جو انسان کیلئے صدقہ جاریہ بن جائے۔ یہ دراصل امت کو دعا مانگنے کا سلیقہ سکھایا جا رہا ہے کہ تم بھی اسی طرح چپکے چپکے، عاجزانہ، والہانہ انداز میں اللہ تعالیٰ سے مناجات کیا کرو، دعائیں مانگا کرو۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی ایک اور دعا ہے:

رَبِّ لَاتَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ (الانبیاء:۸۹)

''اے میرے رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑیئے اور آپ سب وارثوں میں سے بہتر ہیں۔''

حضرت زکریا علیہ السلام کی ایک اور دعا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نقل فرمائی ہے:

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً-اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (آل عمران:۳۸)

ترجمہ: ''اے میرے رب! مجھے اپنی بارگاہ سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بیشک تو ہی دعا سننے والا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں:

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کی بھی دعائیں منقول ہیں، آپ بھی بہت دعا کرنے والے تھے، اور دعا میں جلد باز نہیں تھے، پیہم دعا کرتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ بہت حلیم اور بردبار تھے:

''اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ'' (توبہ:۱۱۴)

ترجمہ: ''بیشک ابراہیم بہت آہ وزاری کرنے والے، بہت برداشت کرنے والے تھے۔''

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں جا کر اولاد ملی وہ نیک اولاد کی دعا مانگتے تھے:

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (سورۃ الصافات،۱۰۰) ''اے اللہ مجھے نیک بیٹا عطا فرما''۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْم (سورۃ البقرۃ:۱۲۸)

''اے ہمارے رب: ہمیں ایسی توفیق دیجئے کہ ہم (سچے) مسلم (یعنی آپ کے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنی فرمانبردار بنائیے اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے دکھا دیجئے اور ہماری توبہ قبول کیجئے۔ بے شک آپ ہی نہایت توبہ قبول کرنے والے، نہایت رحم فرمانے والے ہیں۔''

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے بتوں کی پوجا سے بچنے کی دعا مانگی:

وَاجْنُبْنِی وَبَنِیَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ،رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ (سورۃ ابراہیم:۳۵)

''(اے اللہ!) مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچانا۔ میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔''

رَبِّ اجعَلْنِی مُقِیْمَ الصّلوٰةِ وَمِنْ ذُرِّیّتِیْ رَبّنَا وَ تَقَبّلْ دُعَآء (سورۃ اِبراہیم:۴۰)

اے میرے رب! مجھے توفیق دیجیے، کہ میں نماز قائم کروں اور میری نسل کو (بھی اس کی توفیق ملے)۔ اے میرے رب! میری دعا آپ کے حضور قبول ہو۔

عام طور پر لوگ اپنی اولاد کو وہاں بساتے ہیں جہاں دنیوی وسائل و اسباب کی کثرت ہو، پانی کی فراوانی ہو، اناج، سبزیاں اور پھل وافر مقدار میں ہوں، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معیارِ انتخاب یہ نہ تھا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو وہاں آباد کیا، جہاں پانی تھا نہ کھیتی، دنیوی وسائل تھے نہ سامانِ تعیّش تھا، لیکن وہ مقام حرمت والے گھر کی جگہ تھی اور وہاں اولاد کے بسانے میں ان کا مقصود یہ تھا کہ وہ اللہ کے مقدس گھر میں نماز قائم کریں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام دعا فرماتے ہیں:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْکُرُوْنَ○ (ابراھیم:۳۷)

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی بعض اولاد کو تیرے باعزّت گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں بسایا

ہے، جہاں کھیتی نہیں ہوتی، اے ہمارے پروردگار! غرض صرف یہی ہے کہ وہ نماز قائم کریں، اس لیے تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف پھیر دے اور انھیں (انواع واقسام کے) پھلوں سے روزی عطا کر، تا کہ وہ ہمیشہ تیرے شکر گزار رہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی سے پوچھا: ''تمہارا کھانا اور پینا کیا ہے؟'' انہوں نے جواب میں عرض کیا: ''گوشت کھاتے اور پانی پیتے ہیں۔'' (یہ سن کر) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے) کہا:

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُمْ فِیْ طَعَامِھِمْ وَشَرَابِھِمْ (صحیح البخاری، کتاب الانبیاء)

''اے اللہ! ان کے کھانے اور مشروب میں برکت عطا فرمائیے۔''

امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے، کہ انہوں نے بیان کیا: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے لیے (اللہ تعالیٰ کی) پناہ طلب کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''تمہارے باپ (یعنی جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام) ان (کلمات) کے ساتھ اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کے لیے (اللہ تعالیٰ) کی پناہ طلب کیا کرتے تھے:

أَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَھَامَّۃٍ وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّۃٍ (بخاری)

''میں اللہ تعالیٰ کے کامل (تاثیر والے) کلمات کے ساتھ ہر ایک شیطان، ہر زہریلے جانور اور ہر نقصان پہنچانے والی نظر بد سے پناہ طلب کرتا ہوں۔''

حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی دعا:

حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش ہوئی تو ان کی والدہ شیطان سے ان کی حفاظت کے لیے یوں دعا کی:

وَإِنِّی أُعِیذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیمِ"

میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں (آل عمران:۳۶)

یہ مقبول دعا ہے، اپنی اولاد کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ایمان والوں کی اپنے اور اولاد کے لیے دعائیں:

"رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّیَّاتِنَا قُرَّۃَ أَعْیُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَاماً

اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما (الفرقان:۷۴)

نیک بندے اپنی دعاؤں میں اپنے والدین کے ساتھ اپنی اولاد کو بھی نہیں بھولتے۔فرمایا:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (الاحقاف:۱۵)

''میرے پروردگار! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر بجالاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں اور ایسے نیک کام کروں جنھوں تو پسند کرتا ہے اور میری اولاد کو نیک بنادے، میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور بیشک میں تیرے فرماں برداروں میں سے ہوں۔''

ایمان والوں کے آباء وازواج اور اولاد کے حق میں فرشتوں کی دُعا

رَبَّنَا وَاَدْخِلْھُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ نِ الَّتِیْ وَعَدْتَّھُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِھِمْ وَاَزْوَاجِھِمْ وَذُرِّیّٰتِھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (سورہ مومن)

''اے ہمارے رب! اور انہیں بہشتوں میں داخل کر جو ہمیشہ رہیں گی جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کو جو ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے نیک ہیں، بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔''

لفظ ''ذُرِّیَّة'' کی وسعت:

اِن دُعاؤں کی جامعیت کا اس بات سے اندازہ کیجیے کہ اکثر دعاؤں میں لفظ ''ذُرِّیت'' آیا ہے، یہ لفظ محض اپنی ذاتی اولاد کو شامل نہیں بلکہ اولاد، اولاد کی اولاد اور آئندہ نسلوں کو بھی شامل ہے.....لغت میں ذُرِّیَّةً کے معنیٰ نسل کے ہیں، خواہ مذکر ہو یا مؤنث؛ یہ لفظ سب کو شامل ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے بندوں کو ایسی جامع دعائیں عطا فرمائی ہیں کہ وہ اولادیں اور نسلیں بھی ان دعاؤں میں شامل ہوگئیں جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئیں اور عالم ارواح میں ہیں۔

والدین صبح وشام ایک مرتبہ یہ دعا ضرور کریں، تاکہ انھیں اپنے اہل وعیال سے متعلق عافیت ملے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا ہمیشہ صبح وشام کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے:

اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ اَسْاَلُکَ الْعَافِیَةَ فِیْ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ، اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ اَسْاَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ، اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَآمِنْ رَوْعَاتِیْ، اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ

یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَّمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ، وَمِنْ فَوْقِیْ، وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِکَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ. (سنن ابی داوود)

ایک بڑھیا سے پوچھا گیا کہ آپ کی اولاد بہت صالح، با اخلاق اور ملنسار ہے، آپ نے ان کی کس طرح تربیت کی؟ تو اس نیک بخت نے جواب دیا کہ میں نوافل کے سجدوں میں یہ دعا کرنا کبھی نہیں بھولتی:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ وَاِیَّاھُمُ الْعِلْمَ النَّافِعَ ،وَالرِّزْقَ الْوَاسِعَ،وَالْعَمَلَ الصَّالِحَ،وَارْزُقْنِیْ بِرَّھُمْ ،وَارْضَ عَنِّیْ وَعَنْھُمْ۔

''اے اللہ! مجھے اور میری اولاد کو علم نافع؛ رزق واسع؛ عمل صالح عطا فرما، اور ان کی نیکی سے مجھے بھی حصہ عطا فرما، اور مجھ سے اور ان سے راضی ہو جا۔''

پھر کہا کہ میں نے تربیت اور دعا؛ دونوں کو جمع کیا، محض تربیت پر اکتفا نہیں کیا۔

تربیت کے ساتھ ساتھ ان دعاؤں کو بھی معمول بنالینا چاہیے:

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْ اَوْلَادِیْ وَوَفِّقْھُمْ لِطَاعَتِکَ رَبِّیْ ارْزُقْ ذُرِّیَّتِیْ صُحْبَةَ الْاَخْیَارِ

اللّٰھم اَعِنِّیْ عَلٰی تَرْبِیَتِھِمْ وَتَادِیْبِھِمْ،وَاجْعَلْ ذالِکَ خَیْرًا لِیْ وَلَھُمْ

اللّٰھم اجْعَلْھُمْ مِنَ السُّعَدَاءِ الْاَتْقِیَاءِ الْاَغْنِیَاءِ الْاَسْخِیَاءِ الْحُلَمَاءِ الرُّحَمَاءِ الْعُلَمَاءِ

اللّٰھم عَظِّمْ مَکَانَتَھُمْ وَارْفَعْ شَانَھُمْ،اللّٰھم اَعِزَّھُمْ وَلَا تُذِلَّھُمْ ،وَارْزُقْھُمْ حُسْنَ الْخُلُقِ وَالصِّحَّةِ وَالْعَافِیَةِوَالذَّکَاءِ.

اللّٰھم اِنِّیْ اَدْعُوْکَ بِاسْمِکَ الْوَاحِدِ الْاَحَدِالْفَرْدِالصَّمَدِاَنْ تَرْزُقَ ذُرِّیَّتِیْ حَظًّا فِی الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا،اَللّٰھُمَّ اَنْعِمْ عَلَیْھِمْ بِالصِّحَّةِ وَالْعَافِیَةِ وَالذَّکَاءِ وَارْزُقْھُمْ حُسْنَ الْخِلْقَةِ وَالْخُلُقِ

اَللّٰھُمَّ احْفَظْھُمْ مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ وَعَنْ شَمَائِلِھِمْ وَمِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِھِمْ .....وَصَلِّ اللّٰھُمَّ وَسَلِّمْ عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ.

☆.....☆.....☆

سوشل میڈیائی مصلحین ومفکرین.....دعوتِ محاسبہ

ابودانیال محمد رضی الرحمٰن قاسمی

ذرائع ابلاغ میں انقلابی تبدیلیاں:

گزشتہ چند دہائیوں میں ذرائع ابلاغ نے غیر معمولی ترقی کی ہے، اخبار ورسائل سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا دور آیا، پھر انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے آنے سے ذرائع ابلاغ اس قدر تیز ہوگیا ہے کہ چند دہائیاں قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کچھ فائدے:

ذرائع ابلاغ کی اس تیز رفتاری سے یقیناً بہت سارے فائدے بھی ہوئے ہیں کہ پہلے جن معلومات کے حصول اور ترسیل میں دنوں، ہفتوں، مہینوں؛ بلکہ سالوں گزر جاتے تھے، ان کا حصول اور ان کی ترسیل چند گھنٹوں، چند منٹوں، بلکہ چند پلوں میں ممکن ہوگئی ہے، یقیناً یہ بڑا انقلاب ہے اور اس کی وجہ سے بہت سارے کاموں میں بہت زیادہ انرجی اور وقت بچ جاتے ہیں۔

دعوتی نقطۂ نظر سے بھی ذرائع ابلاغ کی اس ترقی کی وجہ سے کام بہت آسان ہوگیا ہے کہ اپنی چیزیں اور اسلام کا آفاقی پیغام بہتر سے بہتر اسلوب میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا نہایت ہی آسان ہوگیا ہے، اسی طرح ملحدین، اسلام دشمن عناصر اور مسلمانوں کے بیچ اور دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے تئیں شبہات پیدا کرنے والوں کا تحقیقی اور بہ وقت ضرورت مسکت جواب دینا اور اسے بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہنچانا بھی بہت ہی سہل ہوگیا ہے۔

علمی وتحقیقی میدان میں کام کرنے والے افراد کے لیے بھی یہ سہولت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے مطلوبہ مواد اور معلومات تک بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں اور اس حوالے سے دوسرے ایکسپرٹ اور متخصص لوگوں کی آراء، نقطہ ہائے نظر اور تحقیق سے بہ آسانی استفادہ کرکے اپنے کام کو زیادہ باوزن اور مفید بنا سکتے ہیں اور اس کے بعد اپنی کاوشوں کو استفادے کے لیے بڑے پیمانے پر نشر کرسکتے ہیں۔

چند نقصانات:

ان جیسے اور دوسرے بہت سارے فائدوں کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ کی تیز رفتاری نے اور خاص کر سوشل

میڈیا کے بہت زیادہ رواج پا جانے اور ہر عام وخاص کی اس تک بہ سہولت رسائی نے افراتفری کا ماحول اور انفرادی واجتماعی سطح پر انسانی، مذہبی، سماجی اور اخلاقی ایسے چیلنجز کھڑے کر دیے ہیں، جن کا تصور چند دہائیوں قبل ممکن نہیں تھا اور ذرائع ابلاغ کی اس تیز رفتاری خاص کر سوشل میڈیا کے بہ آسانی ہر عام وخاص تک رسائی نے اکثر لوگوں کے حق میں ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے، جیسے کہ ناسمجھ بچوں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے لیے چھری اور دوسری مہلک چیزیں دے دی جائیں کہ ان چیزوں کا یقیناً صحیح استعمال بھی ہے اور انسانیت کو اس کی ضرورت بھی ہے اور اس سے بہت سارے فائدے بھی ہیں؛ لیکن ناسمجھ بچوں کے ہاتھ میں ان کا ہونا نقصان، تباہی اور ہلاکت وبربادی ہی کا سبب بن سکتا ہے۔

مختلف سروے کے ذریعے یہ بات معلوم ہوئی ہے؛ بلکہ ہر معمولی سمجھ بوجھ والا انسان اپنے اردگرد کے مشاہدے کے ذریعے بھی یہ جان سکتا ہے کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے صارفین میں زیادہ تر لوگ اِن کا اوسطاً 90% کے آس پاس بے مقصد اور بسا اوقات تباہ کن استعمال کرتے ہیں۔ اور روزانہ کئی کئی گھنٹے عمر عزیز کے قیمتی اوقات کو ضائع کرتے ہیں؛ حالانکہ اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ ''زندگی درحقیقت وقت ہی کا نام ہے جو کہ ہمیں پیدائش سے لے کر موت کے بیچ تک ملتا ہے'' گویا کہ وقت کو ضائع کرنا زندگی کو ضائع کرنا ہے۔

سوشل میڈیائی مصلحین ومفکرین:

سوشل میڈیا کے اس پھیلاؤ نے ایک اور بڑا مسئلہ یہ پیدا کیا ہے کہ دینی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، سائنسی، تاریخی اور مختلف میدان میں بزعم خود ''مصلحین'' اور ''مفکرین'' کا ایک بڑا جتھا اپنے خیال کے مطابق انسانیت کی اصلاح اور اس کو نفع پہنچانے کے لیے سوشل میڈیا پر کمربستہ ہو گیا ہے۔

سوشل میڈیائی مصلحین ومفکرین کے نمایاں اوصاف:

ان مصلحین اور مفکرین کی کارکردگی اور چند نمایاں اوصاف یہ ہیں:

۱- یہ اپنے موضوع سے متعلق بلکہ غیر متعلق ہر اہم اور غیر اہم؛ بلکہ لغو قسم کی باتوں کو نقل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا اپنی نہایت ہی اہم ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

۲- اپنے موضوع سے متعلق اور غیر متعلق مراسلوں اور پوسٹ پر تبصرہ کرنا اور ان کے بارے میں اپنی معقول و نامعقول رائے اور تجزیہ پیش کرنا نہایت ہی اہم فریضہ اور ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

۳- بیہودہ باتوں کو اور ایسی باتوں کو جو لوگوں کی کردار کشی پر مشتمل ہو اور جن میں استہزاء اور مذاق اڑایا گیا ہو،

انہیں بہ زعمِ خود بغرض اصلاح نہایت ہی مخلصانہ طور پر لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں۔

۴- بدزبانی اور بیہودہ جملوں کا بے دریغ استعمال نہ صرف روا سمجھتے ہیں؛ بلکہ انھیں اپنے لیے باعث عزت وفخر گردانتے ہیں۔

۵-ان کی تحقیقی باتوں میں حقیقتاً تحقیق اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی سچی طلب اور جستجو کے بجائے بدگمانی کا عنصر بڑی وافر مقدار میں ہوتا ہے۔

۶-''بغرض اصلاح'' مختلف موقعوں پر اپنی بات کی تائید وتصویب میں جھوٹ، دجل وفریب اور حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا بھی کام کرتے ہیں۔

۷- اللہ نے بحیثیت انسان ہر شخص کو عزت وتکریم سے نوازا ہے، یہ اپنے اس طرح کے طرز عمل سے جہاں دوسروں کو بے عزت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہیں اپنی سطحیت اور گری ہوئی سوچ کا اظہار کر کے اپنے آپ کو بڑے پیمانے پر بے عزت کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

سوشل میڈیائی مصلحین ومفکرین کا طرز عمل دین اور اخلاق کے میزان میں:

جو لوگ ملحد ہوں، دین اور اخلاق دونوں سے عاری ہوں یا مذہب کے پیروکار ہوں؛ لیکن اخلاق سے عاری ہوں، ایسے لوگوں کے حق میں تو صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ عزوجل ان کے اندر دین واخلاق پیدا کرے یا یہ کہ اخلاقی قدروں سے ان کی زندگی کو آراستہ کرے!

درج ذیل معروضات ان سوشل میڈیائی مفکرین ومصلحین کی خدمت میں پیش ہیں، جو نہ تو دین کے منکر ہیں اور نہ ہی ایسے ہیں کہ اخلاقی قدروں کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ سماجی اور عقلی طور پر بھی یہ ایک مبینہ حقیقت ہے کہ وہ شخص جو ہر سنی ہوئی اور اس تک پہنچی ہوئی باتوں کو نقل کرتا ہے اور آگے پہنچاتا ہے، وہ بہت ساری باتوں میں جھوٹا ہوتا ہے یا کسی جھوٹے کا آلہ کار بنتا ہے، اسی حقیقت کو سید الاولین والآخرین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع ۔(صحیح مسلم) ترجمہ: کسی انسان کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ as received یا ''منقول'' لکھ دینے سے انسان جھوٹے ہونے کے دائرہ سے نہیں نکل جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ نہایت ہی سادہ سا سوال ہے کہ کسی بھی فرد کو اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ہر سنی

ہوئی یا اس تک پہنچی ہوئی بات کو دوسروں تک ضرور منتقل کرے ہی؟!۔

دوسری بات یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے یا سوشل میڈیا پر آنے والے ایسے مراسلوں اور پوسٹ پر تبصرہ کرنا یا ان پر کوئی مختصر یا مفصل تجزیاتی تحریر لکھنا جس کا دینی و دنیاوی کوئی فائدہ نہ ہو لغو کام ہے اور ایک مسلمان کو اور اچھے اخلاق کے حامل فرد کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ لغو کاموں میں اپنا وقت اور اپنی طاقت صرف کرے، چنانچہ اللہ عزوجل نے مؤمنوں کے اوصاف میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ وہ لغو کاموں کے پاس سے اعراض کر کے گزر جاتے ہیں:

وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (الفرقان)

اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک اچھے مسلمان کی یہ صفت ہی بتائی ہے کہ وہ لغو اور فضول کاموں سے مکمل طور پر اجتناب و اعراض کرے: **من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه**۔ (سنن ترمذی)

تیسری بات یہ ہے کہ بے ہودہ اور فحش باتوں کو پھیلانا نہ تو کسی صاحب ایمان کو زیب دیتا ہے اور نہ ہی اچھے اخلاق کے تقاضوں سے میل کھاتا ہے، قرآن کریم نے فحش اور بیہودہ باتوں اور چیزوں کو پھیلانے والوں کے لیے دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ (النور)

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلمان بیہودہ گوئی کرنے والا اور فحش باتیں کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ (سنن ترمذی)

اور قرآن وسنت سے یہ بات ثابت ہے کہ ایسی باتیں جو کسی کے استہزا پر مشتمل ہوں، بدترین قسم کا اخلاقی جرم اور صریح ظلم ہے۔ (الحجرات، سنن ابوداود، صحیح بخاری)

چوتھی بات یہ ہے کہ بدگمانی ایک نہایت ہی بدترین قسم کی صفت ہے چنانچہ اسی وجہ سے اللہ عزوجل نے بدگمانی تو کجا بہت زیادہ گمان اور ظن سے بھی کام لینے سے منع فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ** (الحجرات) ترجمہ: اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جھوٹ بولنا وہ بدترین عمل ہے جو عقل، شریعت اور سماج ہر ایک کی نگاہ میں قابل مذمت ہے قرآن وسنت کے مختلف نصوص میں بھی اس کی قباحت وشناعت کا ذکر موجود ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ بحیثیت انسان اللہ عزوجل نے ہر انسان کو معزز ومکرم بنایا ہے، قرآن کریم میں ہے: **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ**۔ (الاسراء) ترجمہ: اور ہم نے انسان کو باعزت بنایا۔

اور یہ کہ عزت اور ذلت اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: **وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن**

تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران) ترجمہ: اور تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور تو جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔

اپنی باتوں اور کارکردگی کے ذریعے کسی کو بے عزت کرنے کی کوشش کرنا نہایت ہی مکروہ اور گھناؤنا عمل ہے۔ نیز جھوٹ، بدگمانی، دجل وفریب، استہزاء، نامعقول رائے اور لغو قسم کی باتوں کے ذریعے دوسروں کو بے عزت کرنے کی کوشش درحقیقت اپنے آپ کو بھی بے عزت کرنے کو مستلزم ہے اور خود کو بے عزت کرنے کی کوشش عقل وشرع دونوں کے میزان میں ایک احمقانہ حرکت ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لیے بھیجا تھا، لیکن قرآن کریم میں متعدد جگہ اس بات کی صراحت بھی فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بہتر اسلوب میں اللہ کی طرف سے آئے ہوئے پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کو دین پر لانا اور ان کو اچھے اخلاق سے متصف کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ کار میں نہیں ہے: لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیۃ:۲۲، نیز دیکھئے: کہف:٦)

ہم اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوت واصلاح کے کاموں میں نائب ہیں، لہٰذا ہماری بھی ذمہ داری بس اتنی ہے کہ ہم لوگوں تک صحیح پیغام پہنچانے کی کوشش کریں؛ لیکن اصلاح کی اس کوشش میں یہ ہمارے لیے لازمی اور ضروری ہے کہ صحیح اسلامی اور اخلاقی خطوط پر یہ کام کریں، اصلاح کے نام پر غیر اخلاقی ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ درحقیقت یہ اصلاح کا طریقہ بھی نہیں ہے؛ بلکہ اپنے نفس اور شیطان کی پیروی ہے اور اپنے اندر پائے جانے والے غیر اخلاقی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔

سوشل میڈیائی مصلحین اور مفکرین سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ کتاب وسنت، عقل سلیم اور اخلاق کے معیار کو سامنے رکھ کر یہ غور کریں کہ کیا واقعی وہ مصلحین اور مفکرین ہیں یا اپنے غیر اخلاقی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کی کوشش میں لگے ہیں اور درحقیقت اصلاح کے پردے میں فساد پھیلانے کا بدترین کام کر رہے ہیں؟ جس پر اللہ عزوجل نے سخت وعید فرمائی ہے۔

☆.....☆.....☆

صوبہ خیبر پختونخوا میں وفاق المدارس کی سرگرمیاں

مولانا مفتی سراج الحسن

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کے فیصلے کی روشنی میں ملک پاکستان کے دیگر صوبوں کی طرح صوبہ خیبر پختونخوا میں ''تدریب المعلمین'' کے عنوان سے کامیاب، شاندار اور منظّم تدریبات منعقد ہورہی ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلا اور مرکزی دوروزہ پروگرام ضلع پشاور میں بتاریخ 17 اور 18 جون کو بمقام جامعہ دارالفرقان الکریم حیات آباد میں منعقد ہوا۔ جس کی رپورٹ گزشتہ شمارے میں نذر قارئین کی گئی، تاہم اس کے بعد ناظم وفاق المدارس العربیہ صوبہ خیبر پختونخوا حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے پورے صوبے میں تدریبات کے لیے از خود شیڈول مرتب کیا، چنانچہ اس سلسلے میں ضلع صوابی میں بتاریخ 08 اگست 2023 بروز منگل بمقام خانقاہ شمسیہ شاہ منصور، ضلع چارسدہ میں 31 اگست بمقام جامعہ دارالادب، ضلع مہمند میں بتاریخ یکم اکتوبر مدرسہ عبداللہ بن مسعود گندواتا روخیل، ضلع دیر لوئر، دیر اپر، اور باجوڑ میں بتاریخ 02 اکتوبر بمقام مدرسہ عربیہ کاشف العلوم شیکولئی تیمر گرہ ضلع مانسہرہ میں بتاریخ 03 اکتوبر بمقام جامعہ عمر بن الخطاب شنکیاری، ضلع ڈی آئی خان و وزیرستان میں بتاریخ 04 اکتوبر بمقام جامعہ دارالعلوم محمودیہ عیدگاہ کلاں، ضلع لکی مروت وٹانک میں بتاریخ 04 اکتوبر بمقام جامعہ حلیمیہ درہ پیزو، ضلع بنوں وشمالی وزیرستان میں بتاریخ 05 اکتوبر بمقام جامعہ خیر المدارس حسنی دارشاہ سورانی، ضلع ہنگو اورکزئی اور کرم میں بتاریخ 07 اکتوبر میں بمقام جامعہ دارالعلوم سراج الاسلام کاہی، ضلع بٹگرام میں بتاریخ 08 اکتوبر بمقام مدرسہ ابوبکر صدیق موڑی، ضلع شانگلہ میں بتاریخ 09 اکتوبر بمقام جامعہ عائشہ صدیقہ شنگ بشام، ضلع کوہستان میں بتاریخ 09 اکتوبر بمقام جامعہ امام ابوحنیفہ پٹن کوہستان۔

حضرت نے شیڈول کے عین مطابق تمام تدریبات میں نہ صرف شرکت کی بلکہ تمام امور کی نگرانی بھی فرماتے رہے۔ خیبر پختونخوا میں صرف ضلع مردان، نوشہرہ، کوہاٹ اور کرک کی تدریبات باقی ہیں، تاہم جلد از جلد ان اضلاع میں بھی تدریبات کے انعقاد کو یقینی بنایا جائے گا۔ ان تدریبات کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ماہرین فن یہ بتائیں کہ کس فن سے کس قدر اور کس طرح استفادہ کیا جائے۔ تدریبات کی اہمیت کے بارے میں ناظم اعلی وفاق المدارس العربیہ پاکستان شیخ الحدیث مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم کا یہ قول کافی ہے:

''بلاشبہ معلم اور استاد کی اہمیت ہر دور اور ہر معاشرے میں مسلم رہی ہے۔ استاد قوم کے نونہالوں کے مستقبل کا

معمار اور شخصیت ساز ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کو راسخ فی العلم، اپنے فن میں ماہر، مخلص، صالح، فکرمند اور ہمدرد اساتذہ میسر آجائیں تو اسے ترقی کے زینے طے کرنے میں دیر نہیں لگتی۔''

خیبر پختونخوا کی سطح پر منعقدہ تدریبات میں ماہرین فن اور جید مدرسین نے مختلف فنون کے طرق تدریس پر نہایت جامع اور مفید نکات پیش کیے جس کے مثبت اثرات ہر سو پھیلیں گے۔ تاہم تمام اضلاع کے مدربین کے نام اور بیانات کا خلاصہ یہاں پیش کرنا ممکن نہیں، البتہ تدریبات کے روحِ رواں ناظم وفاق المدارس العربیہ پاکستان صوبہ خیبر پختونخوا حضرت مولانا حسین احمد صاحب زید مجدہم کے بیانات کا خلاصہ افادہ عام کی خاطر پیش خدمت ہے:

مدارس میں امتحانی نظم ونسق کو مزید مستحکم کرنے کے لیے آپ نے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا امتحانی نظم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح وفاق کا امتحانی نظام مثالی اور قابل تقلید ہے، اسی طرح ہمیں مدارس کے اپنے امتحانات کی اہمیت بھی طلبہ کے ذہنوں میں بٹھانا ضروری ہے، کیونکہ تعلیمی نظام کے نظم وضبط کو قائم رکھنے میں امتحانات کو بہت ہی کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اگر امتحانات کا سلسلہ روک دیا جائے تو طلبہ پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ امتحان میں صحیح نظم قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اساتذہ کرام امتحان میں حاضری اسباق سے بھی زیادہ یقینی بنائیں۔

نظام امتحانات کی بنیاد تین چیزوں پر ہے: (۱) سوالیہ پرچہ (۲) جوابی کاپیوں کی جانچ پڑتال (۳) نگرانی

سوالیہ پرچہ کے متعلق چند اہم ہدایات دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ امتحان کا مقصد تعجیز اور طلبہ وطالبات کو عاجز بنانا نہیں، بلکہ ان کی صلاحیتوں کو جانچنا ہوتا ہے، لہٰذا سوالیہ پرچہ میں اس بات کا لحاظ رکھیں کہ تعجیز نہ، ہو بلکہ پرچے میں ذہین، متوسط اور غبی سب طلبہ وطالبات کو سامنے رکھا جائے۔ پرچہ بناتے وقت دورانیہ پیش نظر رہے۔ پرچہ نہ تو اتنا مختصر ہو کہ طالب علم تھوڑے وقت میں حل کر کے فارغ ہو جائے، نہ اتنا طویل ہو کہ پورے وقت میں بھی اس کے جوابات لکھنے میں مشکل کا سامنا کریں۔ پرچہ اس طرح بنائیں کہ متوسط درجے کا طالب علم آدھے وقت سے پہلے اسے حل نہ کر سکے۔ پرچے میں توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک آدھ سوال ایسا بھی ہو جس کی بنیاد پر کمزور مگر محنتی طالب علم کے لیے پرچے میں پاس ہونا آسان ہو اور کچھ باتیں ایسی مشکل لیکن کتاب سے متعلق پوچھی جائیں جن کی بنیاد پر ذی استعداد طلبہ اعلیٰ نمبرات حاصل کر سکیں۔ یعنی پرچہ بنانے میں اعلیٰ، متوسط اور کمزور سب طلبہ وطالبات کی رعایت ہو۔ سوالات میں ابہام نہ ہو بلکہ معقولیت کو جانچا جائے ہر سوال کے کم از کم تین اجزاء بنا کر ان پر نمبرات تقسیم کر دیں اور جز کے متعین نمبر اجزاء کے سامنے لکھ دیں۔ سارے سوالات ایسے نہ ہوں جن سے صرف کتاب کی تقریر رٹنے کا اندازہ ہو۔ آدھے سوالات ایسے ہونے چاہیے جن سے کتاب فہمی کا اندازہ لگایا جا سکے۔

پرچوں کی جانچ پڑتال کا مرحلہ امتحانی نظم کا ایک اہم حصہ ہے، کیونکہ اس کا براہ راست تعلق طلبہ وطالبات کے ساتھ ہے۔ یہ بڑی امانت داری اور ذمہ داری کا کام ہے، لہٰذا اس بارِگراں کو اخلاص، للّٰہیت کے ساتھ سرانجام دیں۔ استحقاق کے مطابق نمبرات لگائے جائیں۔ بصورت دیگر طلبہ کا امتحانی نظام سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ وہ امتحان کو اہمیت نہیں دیں گے۔ نتائج کا مکمل ریکارڈ محفوظ کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ بہت سارے طلبہ پرچہ حل کرنے کے طریقے سے واقف نہیں ہوتے اساتذہ طلبہ کے ساتھ تیاری اور پرچہ حل کرنے کے متعلق مذاکرہ فرمائیں۔ مثلاً کہ رول نمبر صحیح لکھیں، عنوانات واضح قلم سے دیں، جوابات پر نظرثانی کا اہتمام کریں، جوابی کاپی کو ترتیب دینا اور صفحہ نمبر لکھ کر سٹیپل کرانا نہ بھولیں، جوابات میں اجزاء سوال کی ترتیب کی رعایت رکھیں، ایک سوال کے مختلف اجزا کے جوابات متفرق جگہوں میں نہ لکھیں، امتحان ہال کو پندرہ منٹ پہلے پہنچے۔ آخر میں جلد بازی نہ کریں، بال پوائنٹ کا استعمال بالکل نہ کریں۔ ہر طالب علم اپنا قلم، امتحانی گتہ، عنوانات کے لیے رنگین مارکر وغیرہ ساتھ لے کر امتحان ہال میں داخل ہو، تاکہ دوران امتحان یہ اشیاء ایک دوسرے سے مانگنے کی نوبت نہ آئے۔

نگرانی کے متعلق آپ نے کہا کہ نگرانی کا مقصد یہ ہے کہ ہر طالب علم کے استعداد اور قابلیت کا پتہ چل جائے اس لیے ضروری ہے کہ کڑی نگرانی ہو۔ طلبہ کے ساتھ تسامح اور چشم پوشی سے بالکل کام نہ لیا جائے یہ طلبہ کے ساتھ رعایت نہیں، بلکہ زیادتی ہے۔

آپ نے استاد کے لیے نظم ونسق کی پابندی اور معاشرتی آداب کی رعایت کے بارے میں کہا کہ طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لیے فکرمندی مدرسے کے ہر استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ کے بارے میں فکرمندی اور ذمہ داری کا احساس کریں اور اپنے آپ کو بری الذمہ نہ سمجھیں۔ ہر استاد کے ساتھ طلبہ کے حقوق وابستہ ہیں۔ استاد کی حیثیت باغ کے مالی کے مانند ہے۔ جس طرح پودوں کی مناسب افزائش مالی کی توجہ اور محنت کے بغیر نہیں ہوسکتی، اسی طرح ہر استاذ کی فکرمندی کے بغیر طلبہ وطالبات کی تعلیم وتربیت بھی ممکن نہیں۔ یہ صرف مہتمم صاحب اور ناظم مدرسہ کا کام نہیں۔ بلکہ سب اساتذہ کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

درس گاہ میں بروقت جانا استاذ کی اولین ذمہ داری ہے۔ استاد پوری کلاس پر نظر رکھے، دائیں بائیں، سامنے ہر طرف توجہ رکھے۔ اگر صرف مخصوص طلبہ کی طرف توجہ دے تو باقی طلبہ اس کو محسوس کریں گے جس سے ان پر منفی اثر پڑے گا۔ ایک کامیاب استاد پوری درس گاہ کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ کلاس میں پڑھاتے ہوئے طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا مدرس کی ذمہ داری ہے۔ غیر حاضر طلبہ کی فہرست بنائے اور اگلے دن اس سے باز پرس کریں۔ تاہم باز پرس میں خیر خواہی کا جذبہ مدنظر ہو۔ طالب علم کی توہین نہ ہو اور اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ

خدانخواستہ نفرت کرنے لگے۔طلبہ کے لیے استاذ ایک رول ماڈل ہے،لہٰذا ہمارا وضع قطع معلمانہ ہونا چاہیے۔لباس صاف ستھری ہونی چاہیے۔ڈاڑھی اور سر کے بال ٹھیک ہو۔جب اساتذہ خود وضع قطع میں طلبہ کے لیے نمونہ ہو تو تب طلبہ پر ہماری بات مؤثر ہو سکے گی۔ہماری ذمہ داری تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ہے،لہٰذا طلبہ کی تربیت کو اساتذہ بھرپور توجہ دیں اور طلبہ سے کوتاہی اور غلطی ہو جائے تو انہیں تنبیہ دیا کریں۔انہیں اپنے بچے سمجھ کر ان کی اصلاح کریں۔جو بات اخلاص سے کی جائے وہ ضرور اثر کرتی ہے۔

استاذ متاثر کن شخصیت کا مالک ہونا چاہیے۔نہ صرف سبق پر پوری گرفت بلکہ القاء اور الفاظ کے انتخاب پر بھی گرفت ہو۔بالخصوص ابتدائی درجات کے اساتذہ کرام کو کتابوں کی تیاری بہت اہتمام سے کرنی چاہیے۔ایک تو اس لیے کہ اساتذہ خود بھی عموماً مبتدئین ہوتے ہیں اور دوسرا یہ بھی کہ طلبہ بھی مبتدئین ہیں۔عمارت کا دارومدار بنیاد پر ہوتا ہے۔وہ مضبوط ہونا ضروری ہوتا ہے۔ابتدائی درجوں میں محنت کے اثرات آخر تک نمایاں رہتے ہیں،جبکہ ان درجات کی کمزوری ہمیشہ کی کمزوری کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ہماری تعلیم ایسی ہو کہ خود ہمارے لیے بھی مفید ہو اور طالب علم کے لیے بھی اور طلبہ کے لیے اس وقت مفید ہوگی جب استاد خوب مطالعہ کرے۔تدریس کے پہلے دس سال خوب محنت کریں اور یہ محنت خود آپ کے بہتر مستقبل کے زرین ہونے کا زینہ ہے۔پڑھانے سے پہلے نفس عبارت، پھر بین السطور، پھر حاشیہ پھر عربی شرح اگر ضرورت پڑی تو آخر میں اردو شرح کی طرف رجوع ہو۔بین السطور نکات ماہرین فن کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔مطالعہ خوب،اچھا اور زیادہ کیا جائے اس سے فن تدریس میں نکھار پیدا ہوتا ہے،تاہم طلبہ کے سامنے منتخبات رکھے جائے۔اتنا پڑھا یا جائے جتنا فہم کتاب کے لیے کافی ہو۔صرف کتاب کا نہیں بلکہ فن کا مطالعہ کریں۔

آپ نے مزید کہا کہ منصب تدریس منصب رسالت ہے۔مدارس ومساجد میں بیٹھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم دین کی خدمت کر کے اپنی بخشش اللہ تعالی سے کروا کر جنت میں داخل ہو جائیں۔مسجد ومدرسہ سے تعلق اللہ تعالی کا ہم پر عظیم احسان ہے اس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔بظاہر اس میں کوئی مراعات نہیں،لیکن موجودہ دور میں جو اطمینان اور سکون والی زندگی علماء کی ہے وہ کسی اور طبقہ کی نہیں۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کامیاب تدریبات کے انعقاد پر میزبانی کرنے والے تمام مدارس کے مہتممین اور جملہ انتظامیہ وجملہ مسئولین وفاق کا شکرگزار ہے۔انہی کی مساعی اور کوششوں کی بدولت پرسکون ماحول میں تدریبات کا انعقاد ممکن ہوا۔اللہ تعالی سب حضرات کی مساعی جمیلہ قبول فرمائے اور سب کو اپنی شان کے مطابق اجر جزیل عطا فرمائے اور تدریبات کے اس سلسلے کو خیر وبرکت اور مدارس کے روشن مستقبل کی بنیاد بنائے۔☆☆

''تفاسیر اور مفسرین''

مصنف: مولانا مفتی انور خان سالارزئی۔صفحات:410۔طباعت: عمدہ۔ قیمت:لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا:المنہل، گلستانِ جوہر، ومکتبۃ النور بنوری ٹاؤن کراچی۔رابطہ:03353217997

مولانا مفتی انور خان سالارزئی زید مجدہ باصلاحیت نوجوانِ عالم دین ہیں۔مدرس، مصنف اور محقق ہیں، اب تک ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔انہی میں سے ایک زیر تبصرہ کتاب: ''تفاسیر اور مفسرین'' ہے۔یہ کتاب عہد نبوی سے لے کر دور حاضر تک کی عالمی، اور علاقائی زبانوں میں لکھی گئی معروف تفاسیر اور مفسرین کے تعارف پر مشتمل ہے۔کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان میں فی الحال اس سے زیادہ معلومات آفرین کتاب موجود نہیں ہے۔کتاب کے مشمولات کا صحیح اندازہ فہرست سے لگایا جاسکتا ہے۔یہ کتاب ایک مقدمے، تین ابواب اور خاتمے پر مشتمل ہے۔کتاب کے **باب اول** میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قرآن فہمی اور مفسر صحابہ کرام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔**باب دوم** میں مفسر تابعین کی تفاسیر اور اس دور کے متعدد تفسیری مکاتب کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔**باب سوم** میں ۹ فصلیں ہیں۔فصل اول میں تفسیر بالماثور اور اس سلسلے کی اہم کتابوں کا تعارف دیا گیا ہے۔فصل دوم تفسیر بالرائے محمود کی اہم تفاسیر کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ان تفاسیر میں امام رازی کی تفسیر کبیر، تفسیر کشاف، تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک، تفسیر روح العانی، تفسیر ابی سعود وغیرہ شامل ہیں۔فصل چہارم میں تفسیر بالرائے مذموم (بدعتی فرقوں کی تفاسیر) کا جائزہ ہے، اس فصل میں اہم معتزلی تفاسیر، شیعی تفاسیر، زیدی شیعہ تفاسیر، خوارج کی تفاسیر کا تعارف وتذکرہ شامل ہے۔پانچویں فصل میں تفسیر صوفیاء کا تذکرہ ہے۔اس ضمن میں صوفی اشاری تفسیر، ابن عربی اور نظریاتی تفسیر، لطائف الاشارات، امام قشیری، تفسیر ملا علی قاری، حقائق التفسیر للسلمی، روح البیان للبروسی وغیرہ شامل ہیں۔چھٹی فصل میں تفسیر فلاسفہ، فارابی، ابن سینا، اور اخوان الصفا وغیرہ کا تعارف شامل ہے۔فصل ہفتم میں فقہی تفاسیر کا جائزہ شامل ہے، جیسے احکام القرآن للجصاص، احکام القرآن، للکیا ہرسی، احکام القرآن للقرطبی۔ فصل ہشتم میں سائنسی تفاسیر مثلاً تفسیر طنطاوی وغیرہ کا تعارف شامل ہے۔فصل نہم میں معاصر تفاسیر جیسے المنار (سید رشید رضا) تفسیر المنیر (دکتور وھبہ زحیلیؒ) ایسر التفاسیر (شیخ ابو بکر الجزائریؒ) اضواء البیان (علامہ امین شنقیطیؒ) وغیرہ شامل ہیں۔اس فصل میں کل ۲۰ تفاسیر کا تعارف شامل ہے خاتمہ جیسے ''فصل دہم'' ہونا چاہیے اس میں برصغیر میں لکھی اور شائع ہونے والی (دیوبندی، بریلوی، غیر مقلدین علماء کی اردو، عربی، پشتو) تفاسیر کا تعارف وتذکرہ

شامل ہے۔اس فصل میں کل ۴۲ تفاسیر کا جائزہ شامل ہے، جب کہ خاتمہ میں مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی تفاسیر کا تذکرہ شامل ہے۔ان میں انگریزی، فارسی، چینی، عبرانی، سندھی، تراجم وتفاسیر شامل ہیں۔مصنف کا عمومی انداز یہ ہے کہ پہلے مفسر کا تعارف کراتے ہیں، اس کے بعد تفسیر کا چند سطروں میں تعارف پیش کرتے ہیں، پھر تفسیر کے اسلوب، تفسیر کی خوبیوں، خامیوں کے ذکر کے ساتھ تفسیری نمونے بھی بیان کرتے ہیں۔اگر کسی تفسیر کے طریق واسلوب پر کوئی تحقیقی کتاب یا پی ایچ ڈی مقالہ لکھا گیا ہے تو اس کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔مزید برآں تفسیر کے متعلقات :''علم المناسبات''،''علم الوجوہ والنظائر''،''علم مقاصد السور''،''قرآنی موضوعات''،قرآنی معاجم کے متعلق بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

مصنف کے بقول انہوں نے اس کتاب کی تیاری کے لیے محمد حسین ذہبی کی کتاب دارالتفسیر والمفسر ون، اور محمد بن راشد بن محمد البرکۃ کی کتاب کو بنیاد بنایا ہے۔اس کے علاوہ مختلف کتب خانوں میں کتابوں کی ورق گردانی اور انٹرنیٹ پر موجود جدید مواد سے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔یوں اردو زبان میں انسائیکلو پیڈیا یا طرز کی ایک جامع کتاب تیار ہوگئی ہے جو تفسیری ذوق رکھنے والے اہل علم کی ضرورت کو کافی حد تک پورا کرتی ہے۔یہ کتاب اساتذہ تفسیر، اور شعبان کی چھٹیوں میں دورہ تفسیر کرنے والے طلبہ کے لیے بے حد مفید ہے۔

''مثالی استاذ'' (۲ جلد)

تالیف: مولانا محمد حنیف عبدالمجید۔طباعت: عمدہ۔ قیمت لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا: بیت العلم فائزہ ٹیرس نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی۔03222583199

گزشتہ دنوں پے در پے طلبہ کے ساتھ استاد کے تشدد کے تین چار واقعات سامنے آئے تو شدت سے احساس ہوا کہ استاذ حفظ کا ہو یا درجہ کتب کا ان کی اخلاقی اور جذباتی تربیت انتہائی ضروری ہے۔تربیت کے فقدان کی وجہ سے بعض اساتذہ طلبہ کو بے تحاشا مارتے اور تشدد کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ نہ صرف تعلیم سے باغی ہوجاتا ہے بلکہ اس کے والدین اور عزیز واقارب میں بھی دین اور اہل دین کے بارے میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔اس ضمن میں یہ کتاب ''مثالی استاذ'' بے حد اہم تالیف ہے۔ بلاشبہ استاذ یا معلم ہونا اشرف ترین منصب ہے۔استاذ اپنے شاگرد کو محض تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کی تربیت بھی کرتا ہے۔استاذ کی شخصیت جس قدر پرکشش، باصلاحیت اور نفع آور ہوگی اسی قدر آئندہ نسلیں صلاح وفلاح کے سائے میں پروان چڑھیں گی زیر نظر کتاب میں ان خطوط کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر چل کر ایک معلم اور استاذ اپنی شخصیت کو شاگردوں کے لیے نافع بنا سکتا ہے۔عنوانات سے ہی اندازہ

لگا لیجیے مثلاً ''رضائے الٰہی کی نیت سے تدریس کیجیے'' صبر اختیار کیجیے'' ''نرمی اختیار کیجیے۔''غصے پر قابو پائیے'' ''معاف کرنے کی صفت اپنائیے'' ''تکبر سے بچیے۔'' ''سادگی اختیار کیجیے'' ''اپنی غلطی مان لیجیے'' ''ذاتی خدمت لینے سے پرہیز کریں۔'' طلبہ سے مثبت انداز گفتگو اپنائیے۔'' ''کم زور بچوں کو پہلے پڑھایا جائے'' وغیرہ۔''مثالی استاذ'' پہلی جلد ۴۵۵ صفحات اور دوسری جلد ۳۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو ہر مدرسے کے کتب خانے میں ضرور ہونا چاہیے اور اساتذہ کو یہ کتاب پڑھوائی جانی چاہیے۔

آؤ پرسکون زندگی گزاریں

تالیف: فقیر محمد حبیب اللہ نقش بندی۔ صفحات: ۲۸۸۔ طباعت: مناسب۔ قیمت: لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا: ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوّارہ ملتان۔ رابطہ: 03226180738

آج کے پریشان کن حالات میں کون شخص ہے جو پرسکون زندگی نہیں چاہتا۔ مگر ہم نے سکون کو اشیاء میں فرض کرلیا ہے، حالانکہ سکون محض عطاءِ الٰہی ہے اور یہ ان بندوں کو ودِیعت ہوتا ہے جو اپنی بندگی کو اللہ کے لیے خاص کر لیتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ایسے مختصر مختصر اقوال و واقعات سے مزین ہے جو نہ صرف سکون آور ہیں بلکہ اس راستے کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جو انسان کو دائمی سکون کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ''مولانا انور غازی دامت برکاتہم العالیہ'' کی پسند فرمودہ ہے۔

رشحاتِ قلم

مولانا حافظ سید محمد امین الحق رحمہ اللہ۔ صفحات: ۱۶۰۔ طباعت: عمدہ۔ قیمت: لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا رابطہ: ڈاکٹر سید منہاج الحق 03335057383

مولانا سید محمد امین الحق رحمہ اللہ فاضل دیوبند اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے شاگرد تھے۔ امام الاولیا حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ آپ کے مضامین ماہنامہ الرشید ہفت روزہ خدام الدین، ماہنامہ بینات اور ماہنامہ الحق میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کے چار مضامین:

(۱)'' اتحاد اسلامی قرآن و سنت کی روشنی میں''۔ (۲)'' قرآن و سنت کا باہمی تعلق''۔ (۳)'' قربانی کی مشروعیت قرآن و سنت کی روشنی میں''۔ (۴)''موجودہ معاشی بحران اور اسلام'' شامل ہیں۔

ایک صاحب علم کے قلم سے نکلنے والے مضامین اہل علم کے لیے بیش بہا تحفہ ہیں۔

☆☆☆